○ "اگر ماسٹر نعیم اللہ نے اپنی اصلاح نہیں کی تو بزرگوں کی دُعائیں اُنھیں بچا نہیں سکتیں۔"

○ "میں سوسائٹی سے منسلک رہوں یا نہ رہوں مجھے اسکی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن میں اپنا فرض نبھانے سے چشم پوشی کروں اس کی پرواہ مجھے ضرور ہے۔"

بہرائچ ملّی امدادی سوسائٹی کے

عُروج و زوال کی حقیقت

محمد شمیم بہرائچی

بہرائچ ملّی امدادی سوسائٹی کے

○ "اگر ماسٹر نعیم اللہ نے اپنی اصلاح نہیں کی تو بزرگوں کی دُعائیں اُنھیں بچا نہیں سکتیں"۔

○ "میں سوسائٹی سے منسلک رہوں یا نہ رہوں مجھے اسکی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن میں اپنا فرض نبھانے سے چشم پوشی کروں اس کی پرواہ مجھے ضرور ہے"۔

عُروج و زَوال کی حقیقت

محمد شمیم بہرائچی

دو لفظ

آج ہر کوئی یہی پوچھتا ہے کہ ۔ کروڑوں میں رن کرنے والی یہ سوسائٹی ۔ جس کا اس قدر شاندار ماضی تھا۔ آج اس کا یہ حال کیوں ہو گیا ؟ ۔ " ماسٹر صاحب فرماتے ہیں کہ مخالفین و حاسدین نے یہ صورت حال پیدا کر دی۔

میری یہ کتاب " بہرائچ ملی امدادی سوسائٹی کے عروج و زوال کی حقیقت " انہی تمام حقائق اور واقعات پر مبنی ہے۔ کتاب میں ان صفات و حقائق اور واقعات کا بھی ذکر ہے۔ جس کی وجہ سے ماسٹر نعیم اللہ و سوسائٹی کا عروج ہوا۔ اور پھر ان واقعات و حقائق اور ان تمام کمزوریوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو زوال کا سبب بنی۔ یہ کتاب جہاں ملی امدادی سوسائٹی کی مختصر تاریخ ہے۔ وہیں ماسٹر نعیم اللہ کی خوبیوں و کمزوریوں کی داستان بھی ہے۔

محمد شمیم بہرائچی (رکن)
مجلس عاملہ ملی امدادی سوسائٹی بہرائچ

۲۰ ستمبر ۱۹۹۵ء
۵۳۶/۳۳۴ نیو مدح گنج
سیتا پور روڈ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نیپال کی سرحد پر واقع صوبہ اتر پردیش کا اقتصادی، تعلیمی و صنعتی لائن سے سب سے پچھڑا و پسماندہ ضلع بہرائچ جس کی تیس لاکھ کی آبادی میں بارہ لاکھ مسلمان بستے ہیں۔ آج سے ۲۳ سال قبل اس سرزمین پر ایک کمزور نحیف درویش صفت شخصیت ایک مسافر کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ جس کا دل ملت کی زبوں حالی سے پریشان و سرگرداں تھا اور اس میں جو بے چینی اور تڑپن تھی وہ اس شخصیت کے چہرے اور باتوں سے بھی نمایاں تھی۔ اس نے یہاں کے چند سر پھرے نوجوانوں کو جمع کیا۔ انھیں ترغیب و تلقین کی اور کام کرنے کے طریقہ کار پر روشنی ڈال کر و کمیٹی کی تشکیل کر کے چلا تو گیا۔ لیکن اپنا درد، اپنی بے چینی اور تڑپ ان نوجوانوں کو ضرور دے گیا اور یہ واقعہ جولائی ۱۹۷۲ء کا ہے۔ اور یہیں سے ملی امدادی سوسائٹی بہرائچ کا سفر شروع ہوا۔

یہاں معاشی طور سے مسلمانوں ہی کی اکثریت زیادہ پسماندہ اور غربت کے انتہائی درجہ میں تھی۔ جس کا اندازہ مسلمانوں کی آج کی پسماندگی و غربت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۳ سال قبل کیا رہی ہوگی۔ مسلمان کثرت سے سود کی لعنت میں مبتلا تھے۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنے زیورات، مکانات، زمین وغیرہ گروی رکھ کر سودی قرض حاصل کرتے تھے۔ جس کو وہ ادا نہیں کر پاتے تھے۔ نتیجہ میں ان کا اصل مال تو ختم ہو ہی جاتا تھا۔ مزید سود کا بوجھ کئی پشت تک لگا رہتا تھا اور خاندان کے خاندان تباہ ہوتے جاتے تھے اور ہر طرح سے ان کا استحصال کیا جاتا تھا۔ یکہ اور تانگے والوں کے درد بھرے واقعات آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے

سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں۔ جب رمتی[1] سیٹھ قرض وسود ادا نہ کرنے کی صورت میں ان کے تانگے اور یکے کھڑا کرالیا کرتا تھا اور وہ بے چارے ہاتھ جوڑتے اور روتے تھے۔ اور یہ سلسلہ آئے دن ہوتا رہتا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بچپن میں یہ منظر دیکھے ہیں۔

اب آپ صورت حال کا اندازہ خود کرسکتے ہیں کہ ملی امدادی سوسائٹی بہرائچ کا قیام اس وقت کن حالات میں ہوا تھا۔

چونکہ میری وابستگی اس ادارے سے ابتدا سے رہی ۹ جولائی ۷۲ء کو جب اس کا قیام ہوا تو میں انٹر کا طالب علم تھا۔ ماسٹر نذیر[2] صاحب اس کے پہلے صدر تھے لیکن چند میٹنگوں کے بعد غالباً انھیں یہ ڈر لاحق ہوگیا کہ چونکہ اس ادارہ کی بنیاد مالیات پر ہے۔ کہیں کچھ ہوگیا تو بدنامی مفت ہوگی۔ اس لیے انھوں نے آنا چھوڑ دیا اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ کیونکہ سوسائٹی کی ابراہیم شہید محلہ اکبرپورہ میں ہونے والی میٹنگ میں مجھے اور حشمت[3] اللہ کو ماسٹر نظیر صاحب کو بلانے کے لیے ان کے گھر بھیجا گیا تھا۔ مگر وہ بلانے کے بعد بھی میٹنگ میں نہیں آئے۔ ان کے نہ آنے پر بالآخر اسی میٹنگ میں ماسٹر محمد نعیم اللہ کو صدر منتخب کیا گیا۔ سید وصی الدین سکریٹری تھے۔ مولانا محمد عظیم خاں منیجر، منشی ریاض جوائنٹ سکریٹری، حاجی منظور صاحب خزانچی تھے۔ اس کے علاوہ دیگر اور حضرات جن میں یہ خادم بھی تھا بحیثیت رکن کے تھے۔

چٹ فنڈ و کارکنان سوسائٹی کی مخالفت

جن دنوں سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اس وقت ضلع میں چٹ فنڈ ول کا بڑا

۱؎ یہ سیٹھ ضلع بہرائچ کے محلہ چاند پورہ میں ٹھاکر ٹیبر ہا کی کوٹھی کے سامنے رہتا تھا۔ جہاں میرا خود کا بچپن گذرا۔ اور اس طرح پورے ضلع میں نہ جانے کتنے ایسے سیٹھ ساہوکار پھیلے ہوئے ہوں گے جہاں اس قسم کے واقعات ہر روز رونما ہوتے ہوں گے۔

۲؎ جو میرے شفیق استاد بھی تھے۔ ۳؎ میرے دوست و پھوپھی زاد بھائی جو آج جونیر ہائی اسکول بہرائچ میں ٹیچر ہیں۔

زور تھا۔ عوام اور خصوصاً مسلم طبقہ چٹ فنڈوں کے انعامی لالچ میں اس بری طرح پھنسے ہوئے تھے کہ وہ سوسائٹی کی کھاتہ دار بناؤ تحریک کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے عام طور پر یہ سوال پوچھتے تھے کہ جمع کرنے پر کیا ملے گا؟ ان میں ایک مخصوص طبقہ ایسا تھا جو اس تحریک کے کارکنوں کا نہ صرف مذاق اڑا رہا تھا بلکہ شکوک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کا کام کر رہا تھا۔ عوام کو گمراہ کرنے میں اس طبقہ کو اس لیے بھی کامیابی مل رہی تھی۔ کیونکہ جو لوگ ملی سوسائٹی کے قیام کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے۔ ان میں کوئی بھاری بھرکم شخصیت ایسی نہیں تھی جو عوام کی توجہ کا مرکز ہوتی۔ یہ چند سرپھرے نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی جس کا صدر، پرائمری اسکول کا ایک ماسٹر، جس کا سکریٹری ایک کلرک، جس کا جوائنٹ سکریٹری ایک کچہری کا معمولی منشی[1] اور جس کا خزانچی ایک معمولی تاجر اور جس کا منیجر ایک مدرسہ کا معمولی مدرس تھا۔ باقی کارکنوں کے بارے میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کن حیثیتوں کے مالک ہوں گے۔

اخلاص، جد و جہد و اکابرین ملت کی توجہ

یہ تو صورت حال تھی۔ جب پانچ روپیہ کا کسی کو کھاتہ دار بنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن جہاں ایک دھن ہو، ایک سچی لگن ہو اور کچھ کر گزرنے کا ایک جذبہ کارفرما ہو وہاں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ سوسائٹی کے قیام کے لیے جو تڑپ و بے چینی اس نوجوان ٹولی میں (جو اب بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکی ہے) پیدا ہوئی۔ اس نے پھر انھیں بیٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ ابتدا میں قرض کی شروعات ایک سو روپیہ سے کی گئی حاجی منظور صاحب زیورات

---

[1] جوائنٹ سکریٹری منشی ریاض بمشکل تین سال سوسائٹی سے وابستہ رہے بعد تین سال کے انھیں بے ایمانی اور بددیانتی کی پاداش میں سوسائٹی سے بے دخل کیا گیا۔ نکالے جانے کے بعد انھوں نے کبھی سوسائٹی کے خلاف زبان نہیں کھولی اس لیے انھیں صدر صاحب نے بحیثیت ملازم غالباً ۱۹۹۲ء میں پھر سوسائٹی سے وابستہ کر لیا۔ لیکن انھوں نے پھر وہی کیا جو ان کے مزاج میں داخل تھا اس طرح دوبارہ جب بے ایمانی پھر اجاگر ہو گئی تو انھوں نے سوسائٹی آنا بند کر دیا۔

اپ گھڈر رکھتے تھے۔ اس طرح نیک نیتی، خلوص، بے غرضی اور بے لوثی کے ساتھ جس سے جو کچھ بن پڑا اپنی کوشش بھر کیا۔ لیکن صدر ماسٹر محمد نعیم اللہ سکریٹری سید وصی الدین اور اس وقت کے منیجر مولانا محمد عظیم خاں نے یقیناً سوسائٹی کو پروان چڑھانے میں کافی کچھ محنت صرف کی۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ سوسائٹی روپی گاڑی کے یہی وہ تین پہیے تھے جس پر گاڑی کھڑی ہوئی اور چلی تو غلط نہ ہوگا۔ اسی تڑپ و بے چینی، ان تھک محنت و کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سوسائٹی تین سال کے قلیل عرصہ میں نہ صرف ایک حقیقت بن گئی بلکہ اپنی بہتر اور مثالی کارکردگی کی بنیاد پر اکابرین ملت کی توجہ کا مرکز بھی بننے لگی اور جب ۲۶ مئی ۱۹۷۵ء کو مرحوم مولانا انظر شاہ کشمیری استاد دارالعلوم دیوبند بہرائچ تشریف لائے تو انھوں نے سوسائٹی کو دیکھنے کے بعد فرمایا تھا کہ ۔۔ "بہرائچ کی ملی سوسائٹی اگرچہ ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ مگر مجھے کارکنوں کے اخلاص ان کی مستعدی اور خاص لگن سے توقع ہے کہ خدا تعالیٰ بہت جلد اس مفید ادارے کو ایک ایسی مضبوط اور مستحکم تنظیم بنا دیں گے۔ جو قوم و ملت کی بہترین خادم و معاون ہوگی۔" اسی طرح کے تاثرات ۱۹۷۵ء میں ہی حضرت مولانا اسعد مدنی، مولانا سید احمد ہاشمی اور مولانا افضال الحق قاسمی نے بھی سوسائٹی کے متعلق تحریر کئے۔

بلاسودی تحریک و حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

دھیان رہے بلاسودی سوسائٹی و فنڈوں کی یہ تحریک حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے "اپنی مدد آپ" کے اصول کے تحت اسلامی نظریات کی روشنی میں مسلمانوں کو سود کی لعنت و مہاجنوں کے استحصال سے بچانے کے لیے و نیز اقتصادی توانائی پہنچانے کی غرض سے پیش کی تھی۔ چنانچہ انہی اصولوں کی روشنی میں آپ کی ایما و تحریک پر آپ کی زندگی ہی میں ٹانڈہ بادلی رام پور کے چند مخلص لوگوں نے ۱۹۴۰ء میں اس قسم کے ادارے کی بنیاد ڈالی تھی جو بلاسودی نظام کا حامل تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں حضرت مولانا اسعد مدنیؒ نے سرزمین دیوبند میں "مسلم فنڈ" قائم کیا۔ ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد میں "طوبیٰ بیت المال" کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۷۲ء میں اترپردیش کی راجدھانی لکھنؤ میں "مسلم رفاہی سوسائٹی" قائم ہوئی۔ جس کا افتتاح عالم اسلام کی مشہور و معروف شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی نے کی۔ انہی دنوں بہرائچ، بجنور، نجیب آباد، خورجہ

بلند شہر اور دوسرے مقامات پر بلا سودی ادارے وجود میں آئے۔

اداروں کا وفاقی نظام قائم کرنے کی حقیر کوشش

اداروں کی بڑھتی تعداد کے پیش نظر ۱۹۷۵ء سال کے آخر میں سوسائٹی کے صدر ماسٹر محمد نعیم اللہ و سکریٹری سید وصی الدین نے اس نہج پر کام کرنے والے تمام اقتصادی اداروں میں ربط و تعلق پیدا کرنے و نیز ایک وفاقی نظام میں منسلک کرنے اور ایک دوسرے کو قریب لانے کی غرض سے سفر کیے اور اداروں کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں و کانفرنس منعقد کئے جانے کے منصوبہ بنانے کا آغاز کیا ہی تھا کہ ملک میں ایمرجنسی نافذ ہو گئی۔

ایمرجنسی کے حالات اور علماء کا رول

ایمرجنسی کے سایہ میں نسبندی کا قہر عوام اور خصوصی طور پر سرکاری ملازمین پر نازل ہونا شروع ہوا اور دھیرے دھیرے اس کا دائرہ اتر پردیش کے پنڈت وزیر اعلیٰ مسٹر نرائن دت تیواری نے اندرا جی کی خوشنودی میں جو اس وقت ملک کی وزیر اعظم تھیں اس قدر وسیع کیا کہ ظلم و جبر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ عوام میں خوف زدگی کا عالم یہ تھا کہ اس وقت شہر کے شہر غریب مزدوروں سے خالی ہو گئے۔ کسی کام کو کرانے کے لیے مزدوروں کا ملنا مشکل ہو گیا۔

چونکہ نسبندی کا مسئلہ مذہب سے متعلق تھا اس لیے یہ دور مذہبی رہنماؤں کی آزمائش کا تھا۔ اس آزمائشی دور میں علماء کا ایک طبقہ وہ تھا جو کسی خوف و خطر کی پرواہ کئے بغیر حکومت کی اس پالیسی اور اس کے طریقہ کار کا سخت مخالف تھا۔ لیکن چونکہ ملک کے ذرائع ابلاغ پر سنسر شپ لاگو تھی اس لئے کسی اخبارات ریڈیو، ٹی وی پر کوئی خبر حکومت کی اس پالیسی کی مخالفت میں نہیں شائع ہو سکتی تھی۔ یہاں تک کہ کوئی پمفلٹ۔ اشتہار بھی کسی بھی پریس سے چھپنا مشکل تھا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے نسبندی کے خلاف تجاویز پاس بھی کی۔ لیکن حکومت نے اسے کہیں شائع ہونے نہیں دیا۔ خود ہی چھپے بورڈ کی تجاویز کی سائکلو اسٹائل کاپی مجھے اسلامیہ کالج لکھنؤ کے سابق پرنسپل کریم اللہ صاحب کے ذریعہ ملی تھی یہ صورت حال تھی۔ اس صورت حال میں علماء کا دوسرا طبقہ وہ تھا جو مخالف تو تھا لیکن خاموش تھا اور سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ تیسرا طبقہ ان جگادری مولویوں کا تھا جو حکومت کے پنشن یافتہ

تھے یا جنھیں کبھی کبھار حکومت اپنے فائدے کے لیے سرکاری تقریبوں میں بلاکر ان کی عزت افزائی کردیا کرتی تھی۔ ایمرجنسی کے زمانہ میں اس طبقہ کے مولویوں نے حق نمک ادا بھی کیا۔ لیکن اسی تیسرے طبقہ کے مولویوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا۔ جو سرکاری مراعات و سہولیات کا فائدہ بھی اٹھاتا تھا اور مدارس و مکاتب کے ذریعہ قوم کے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت میں نہ صرف کوشاں رہتا تھا۔ بلکہ اپنے عمل و کردار سے عوام میں بھی مقبول تھا۔ لیکن افسوس ایمرجنسی کے اس دور میں مولویوں کا یہ طبقہ اس درجہ گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کا شکار ہوا۔ اور اس پر خوف کی ایسی گھٹا چھائی کہ اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ نتیجہ میں اس طبقہ کے مولویوں نے بعض جگہ اور خصوصی طور پر ہمالیے بہرائچ میں بھی اپنی ایمانی غیرت و حمیت کا اپنے عمل و کردار سے جس طرح کا بھونڈا مظاہرہ کیا وہ بے حد افسوس ناک تھا۔ خوف زدگی کا عالم یہ تھا کہ نسبندی کے جائز ہونے کی بات بغیر کسی دلیل و دلائل کے زبان پر آنے لگی۔ اور یہی تک بس نہیں بلکہ اپنے بچاؤ کے لیے پولیس و انٹلی جنس محکمہ کے سربراہوں تک بھی یہ بات پہنچائی گئی تاکہ گرفتاری عمل میں نہ آئے۔ پھر بھی انھیں گرفتار کرا لیا گیا۔ لیکن چند دنوں بعد چھوڑ بھی دیا گیا۔ گھبراہٹ اور خوف کا عالم یہ تھا کہ چھوٹنے کے بعد بھی انھیں یہ ڈر لاحق رہا کہ کہیں پھر دوبارہ گرفتاری عمل میں نہ آ جائے۔ اس سے بچنے کے لیے انھیں اپنے مقام سے راہ فرار بھی اختیار کرنی پڑی۔ خوف و ہراس اور دل کا دھڑکا جب جا کر ختم ہوا جب کانگریسی گورنر سردار جوگیندر سنگھ کو مدرسہ نور العلوم میں بلا کر نہ صرف سپاس نامہ بھینٹ کیا گیا بلکہ سنجے جی اور کانگریس کی شان میں خوب تر سے خوب تر قصیدہ پڑھا گیا اور ایک لفظ بھی ایمرجنسی اور اس سے پیدا شدہ صورت حال پر کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس طرح کے حالات ایمرجنسی میں رونما ہوئے۔ جہاں تک ہمت و حوصلہ کی بات ہے یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ خداداد ہے۔ لیکن حد درجہ گھبراہٹ اور اس گھبراہٹ میں اپنے کو سنبھال نہ پانا یقیناً افسوس ناک تھا جو بدنامی کا باعث ہوا۔

ملی امدادی سوسائٹی و اس کے صدر کی گرفتاری

ایمرجنسی کا یہ دور ملی امدادی سوسائٹی کے ذریعہ شہرت و مقبولیت پانے والی دو ننھی

ابھرتی ہوئی سماجی شخصیتوں کی بھی آزمائش کا تھا۔ ایک اس کے صدر ماسٹر محمد نعیم اللہ اور دوسرے اس کے سکریٹری سید وصی الدین۔ چونکہ یہ ادارہ مذہبی بنیادوں پر قائم ہوا تھا اور ملت کے ہر معاملہ میں کافی متحرک اور سرگرم تھا۔ اس لیے عوام کی توجہ کا مرکز بھی تھا۔ دھیان رہے ماسٹر محمد نعیم اللہ سوسائٹی کے صدر کے علاوہ سرکاری ملازم تھے اور بہرائچ کے ٹیچروں کی تنظیم پرائمری شکچھک سنگھ کے بھی صدر تھے۔ اسی طرح سوسائٹی کے سکریٹری سید وصی الدین جو حکومت کے محکمۂ صحت میں بحیثیت ایک کلرک ملازم تھے۔ اور یہ دور ہر سرکاری ملازم کے لیے بڑی آزمائش اور پریشانی کا تھا۔ چونکہ سوسائٹی سے وابستہ یہ دونوں افراد سرکاری نوکر تھے اور تنظیم سے نہ صرف وابستہ تھے بلکہ اس کے ذمہ دار تھے۔ اس لیے ان لوگوں کے ہر ہر قدم پر حکومت کی کڑی نظر تھی۔ سید وصی الدین ہر کام محتاط رہ کر کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ اس کے برعکس ماسٹر صاحب کسی خوف و خطر کی پرواہ کیے بغیر کام کرنے کے حامی تھے۔ یہ نظریاتی اختلاف سکریٹری و صدر کے درمیان ہمیشہ رہا۔

ایمرجنسی کے اس دور میں بہرائچ کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن ماسٹر صاحب نے حکومت کی اس پالیسی کے خلاف کچھ بولنے اور کہنے کا جب سنجیدہ ارادہ کر لیا تو بہرائچ کے بہت سے لوگوں نے انھیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کافی کچھ دباؤ ڈال کر کسی طرح انھیں کچھ نہ بولنے اور کہنے پر راضی کیا۔ اس رضامندی کے بعد وہ بہرائچ میں پھر نہیں رکے اور لکھنؤ، دیوبند، سہارنپور اور نہ جانے کہاں کہاں اکابرین ملت اور علمائے کرام سے ملاقات کرتے رہے۔ اس درمیان بہرائچ میں نسبندی کے مسئلہ پر ایک زبردست پمفلٹ بہرائچ کی جامع مسجد میں اس طرح تقسیم ہوا کہ کسی کو یہ تک پتہ نہیں چل سکا کہ کس نے، کون اور کہاں سے یہ پمفلٹ آیا۔ پمفلٹ کے تقسیم ہونے کی خبر پاتے ہی شہر کا خفیہ و بھاگ پولیس و سرکاری افسران سکتہ میں پڑ گئے۔ کافی تفتیش کھوج خبر کے بعد جب کچھ سراغ نہ ملا تو شکوک و شبہات کی سوئی گھومنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماسٹر نعیم اللہ کے بہرائچ میں قدم رکھتے ہی بڑے ڈرامائی انداز سے ان کی گرفتاری ۷ر اکتوبر ۱۹۷۶ء کو عمل میں آئی۔ ساتھ میں ایک گرفتاری اس ضمن

یں ماسٹر انیس[۱] کی بھی ہوئی۔

سوسائٹی کے سکریٹری وکارکنان پر گرفتاری کے اثرات

ماسٹر صاحب کی اس گرفتاری کے بعد سوسائٹی کے سکریٹری سید وصی الدین پر خوف و گھبراہٹ کا طاری ہونا فطری و لازمی تھا۔ اس گھبراہٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وصی صاحب نے سوسائٹی آنا چھوڑ دیا اور تقریباً ایک ماہ سے کچھ زائد یا کچھ کم انھوں نے سوسائٹی سے ایسی دوری بنائی کہ لوگوں کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے وصی صاحب نے اپنے کو سوسائٹی سے لاتعلق کر لیا ہے۔ صدر سوسائٹی کی گرفتاری سے اراکین سوسائٹی و ملازمین سوسائٹی میں بھی خوف تو ضرور پیدا ہوا لیکن سوسائٹی بدستور کھلتی رہی۔ بعد کو سوسائٹی کے حسابات وغیرہ وصی صاحب گھر پر منگا کر دیکھنے لگے تھے۔ دھیان رہے اس وقت سوسائٹی کا دفتر مسجد عالم شہید کی اس دوکان میں تھا جس کو سوسائٹی نے انڈر گراؤنڈ تعمیر کرایا تھا۔ وصی صاحب کے اس عمل سے عوام اور خصوصی طور پر اراکین سوسائٹی و عملہ کے لوگوں نے کچھ اچھا تاثر نہیں لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی وقعت کچھ گھٹ گئی اور کچھ دنوں تک سکریٹری کے رائے اور مشوروں کی بے وقعتی کا سلسلہ اراکین سوسائٹی کی نظر میں قائم رہا۔ حالانکہ اس وقت کے حالات میں وصی صاحب نے اپنی سمجھ سے جو بھی کچھ کیا غلط تھا یا صحیح اس پر میں تبصرہ اس لیے نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ حالات کچھ ایسے ہی تھے۔

جیل کے خطوط اور ماسٹر نعیم اللہ

بہر حال ماسٹر نعیم اللہ چار مہینہ سے کچھ زائد گورکھپور جیل میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ اس دوران انھیں جیل میں بھی سوسائٹی اور سوسائٹی کے زیر انتظام محلہ قاضی پورہ میں چل رہے مدرسہ مدرستہ البنات اور کچھ مسجدوں کی جہاں فکر لاحق رہی۔ وہیں

---

۱ ماسٹر انیس انگریزی کے بہترین لکچرر تھے وہ مرحوم محمود حسن وکیل کے قریبی رشتہ داروں میں بھی تھے۔ سرکاری افسران اور خصوصی طور پر پولیس کے اعلیٰ افسران سے ان کی کافی کچھ یاد اللہ تھی۔ اس لیے ان کی گرفتاری پر عوام کو تعجب ہوا۔

سکریٹری سید وصی الدین کی سوسائٹی سے لاتعلقی کا شکوہ اور افسوس بھی رہا۔ مورخہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو اپنے بھائی حمید اللہ پرنسپل آزاد انٹر کالج کو جو خط تحریر کیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ ــــ "تم لوگوں کو تو صرف میری فکر رہتی ہے اور مجھے مساجد مدرسہ و سوسائٹی کی فکر ہر وقت سوار رہتی ہے"۔ اسی طرح ایک دوسرا خط ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو پرنسپل صاحب کو پھر تحریر کیا اس میں لکھتے ہیں کہ ــــ قاضی کٹرہ کی مسجد اور غلام علی پورہ کی مسجد کا حال لیتے رہنا۔ کرایہ دونوں جگہ کا وصول کر کے اس کی مرمت وغیرہ میں خرچ کر دینا۔ غلام علی پورہ میں ابھی مرمت اور پلاسٹر باقی ہے۔ چچا کو لگا دیں تاکہ وہ دھیرے دھیرے اپنے ساتھ ایک مزدور رکھ کر کام کرتے رہیں۔ داروغہ صاحب کو کرایہ کی نوٹس دلا دینا اور اگر ہو سکے تو غلام علی پورہ میں بھی کرایہ کی نوٹس دے دینا۔ اگر ہا مسجد کی تعمیر کوشش کر کے کرا دینا۔ تاکہ اسی موسم میں سلیب پڑ جائے۔ مدرستہ البنات[۱] کا خیال رکھنا۔ چندہ کی وصولی اور نظام چلانے میں رفیق[۲] کی مدد ضروری ہے۔ قدوس، نیاز، وصی اور حشمت اللہ اور جس کو مناسب سمجھیں مدرسہ کو عمدہ طریقہ سے چلانے میں مدد لینے کی کوشش کرنا۔ کیونکہ مدرسہ کو تعلیمی اور صنعتی ادارہ قائم کرنا ہے جس میں یتیم، بیوہ، لاوارث، غیر شادی شدہ و غریب خاندانوں کی پرورش کا مکمل نظم ہو سکے۔ اور سیکڑوں خاندان اس سے فائدہ اٹھائیں۔ چکیا الٰہی کی مسجد کے کرایہ وصولی کی بھی کوشش کرنا"۔

ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ــــ "مسجد عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ علم کا مرکز بھی ہو"۔ اسی ضمن میں پھر آگے لکھتے ہیں کہ ــــ "پچھلے سال رمضان شریف میں مکہ مکرمہ میں ۸ ممالک کے باشندوں نے مل کر سعودی حکومت کے تعاون سے ایک مساجد کمیٹی کی تشکیل کی ہے جس میں یہاں سے مولانا

---

[۱] مدرستہ البنات لڑکیوں کا ایک مدرسہ سوسائٹی کے زیر انتظام چلتا تھا جس میں ڈھائی تین سو بچیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں غالباً ۱۹۸۰ء یا ۱۹۸۱ء میں مسجد چکیا الٰہی فاسحٰ پورہ کی نئی انتظامیہ سے کچھ ان بن ہو جانے کے نتیجہ میں مکمل طور پر مدرسہ بند کر دینا پڑا۔

[۲] سکریٹری مدرستہ البنات

علی میاں ندوی۔ قاری طیب صاحب اور جماعت اسلامی کے امیر نے شرکت کی تھی۔ اس کی مکمل روداد "زندگی" ایک رسالہ رامپور سے نکلتا ہے۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۷۶ء کے رسالہ میں آئی ہے اس کا سالانہ چندہ پندرہ روپیہ ہے۔ روپیہ روانہ کر کے سالانہ خریداری ممبر بن کر یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۷۶ء سے منگالیں۔ گھروں کے لیے مفید ہے۔"

اس طرح ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ۔۔۔ "خداوند قدوس لوگوں میں دینی تڑپ پیدا کرے اور ہمارے اخلاق میں درستگی، معاملات میں سچائی، دیانتداری، ہمت اطاعت و شجاعت عاجزی، بردباری و انکساری کی دولت نصیب کرے۔ ساتھ ہی صراط مستقیم پر چلائے اور تعصب ظلم و جبر میں صبر کی توفیق نصیب کرے۔"

غرض کہ نمونہ کے طور پر یہ چند خطوں کے اقتباس پیش کیے ہیں ورنہ اُن کے بیشتر خطوط، سوسائٹی، مسجد، مدرسہ، نصیحت آمیز تلقین و ترغیب پر مشتمل ہیں جنھیں آج بھی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریر کے پیچھے ایک تڑپتا ہوا دل ہے جو اپنے آپ کو ملت کے لیے کھپا دینا چاہتا ہے اور حقیقت میں اس نے اپنے آپ کو کھپا یا بھی۔ لیکن اب یہ ساری باتیں قصہ پارینہ کی داستان بن چکی ہیں۔ کیونکہ اب اس طرح کی باتوں کا تذکرہ بے مصرف ہے۔ وجہ یہ کہ اب ہم وہ نہیں رہے جو کل تھے۔۔۔ ہم بدل گئے ہمارے سوچنے کے ڈھنگ بدل گئے، ہماری فکریں بدل گئیں۔

ماسٹر نعیم اللہ سوسائٹی سے قبل اور اس کے بعد

دھیان رہے کہ ماسٹر صاحب کی جب سے سوسائٹی سے وابستگی ہوئی انھوں نے اپنی تمام تر دوسری سرگرمیوں سے دھیرے دھیرے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے آپ کو سوسائٹی کے لیے وقف کر دیا۔ وہ والی بال کے بہترین کھلاڑی تھے۔ آدرش کلب کے نام سے انھوں نے ایک تنظیم بنا رکھی تھی اور جب تک وہ اس کھیل اور کلب سے وابستہ رہے بہرائچ میں یہ کھیل اپنے شباب پر رہا۔ کھیل جیسے مشغلہ اور اس تنظیم سے انھیں والہانہ عشق تھا۔ لیکن سوسائٹی کے قیام اور اس سے وابستگی کے بعد انھوں نے اپنے اس مشغلہ کو جو انھیں بے حد عزیز تھا۔ اتنی جلد خیر آباد کر دینا۔ یقیناً تعجب خیز تو تھا ہی۔ اس سے زیادہ تعجب خیز

تو یہ ہوا کہ ان کی اپنی ذات میں بھی ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ وہ نعیم اللہ جو نماز و دین سے بے پرواہ تھے۔ جو سنیما بینی کے بھی دلدادہ تھے اور جن کی گذشتہ غالباً ۶۵ء سے قبل اور اس کے بعد کی بھی لاابالی اور غیر ذمہ دار زندگی سے ان کے والد یعنی میرے نانا حافظ محمد سمیع اللہ صاحب پریشان رہا کرتے تھے۔ سوسائٹی سے وابستگی اور ذمہ داری نے انھیں یک بیک بدل کر رکھ دیا۔ وہ تبلیغی جماعت سے بھی وابستہ ہوئے۔ تین دن اور چلّے بھی لگائے اور سوسائٹی اور ملّت کے دوسرے مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کرنے لگے۔

غرض اس طرح سے سوسائٹی سے ان کا تعلق دیوانگی کی حد تک قائم ہو گیا اور انھوں نے اپنے آپ کو سوسائٹی سے اس طرح وابستہ کر لیا کہ انھیں ہر وقت اپنی نوکری، اپنے گھر سے کہیں زیادہ سوسائٹی کی فکر رہی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنا سارا وقت سوسائٹی کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے جتنی قربانی دی ہے شاید ہی کوئی دے پاتا۔ اور اس حقیقت سے آج بھی ان کے مخالفین و حاسدین بھی انکار نہیں کر سکتے۔ ان میں حوصلے، جرأت اور ہمت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ ہمت و استقلال کے پہاڑ تھے ہی۔ لیکن جیل جانے کے بعد ان کے حوصلہ اور ہمت میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ ان میں خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ کام کرنے میں بھی شدت پیدا ہوئی۔ ان میں مصلحت بینی نرم گفتاری صبر و خلوص کے ساتھ ساتھ تواضع و توسع عاجزی و انکساری غم خواری بردباری دوراندیشی غرض کہ وہ تمام خصوصیت اللہ نے اپنے خصوصی کرم سے بیک وقت ان میں پیدا کر دی تھیں جو ایک بہتر انسان میں ہونی چاہیئے تھی کہ ایک غریب رکشہ والا ایک غریب کسان بھی بڑے فخر کے ساتھ کہتا تھا کہ ہمارے گھر ماسٹر صاحب آئے تھے معنوں ماسٹر صاحب کوئی بہت بڑی ہستی تھی شہر و ضلع میں جس راستے اور جہاں کہیں بھی گذر جاتے لوگوں کی محبت بھری نظریں ان پر پڑتیں لوگ سلام کرتے جہاں کہیں پہنچ جاتے لوگ ان کی اور ان کے لواحقین کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں رکھتے تھے۔ ان میں تنگ نظری نام کو نہیں تھی ہر اسٹیج کے ہر ادارے سے انھیں محبت و لگاؤ اتنا ہی تھا جتنا کہ سوسائٹی سے چاہے

وہ مدرسہ نور العلوم ہو یا مسافر خانہ یا اور دوسرے ادارے ان کی طبیعت میں نرمی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ پریشان حال اور دکھیاروں کی ہر ممکن مدد کرتے تھے ان میں نفاست پسندی نام کو بھی نہیں تھا کھانا کھانے بیٹھتے تو کام کرنے والے مزدوروں تک کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل کر لیا کرتے تھے اور یہ پہلو اُن میں زیادہ نمایاں رہا۔ اور اب بھی نمایاں ہے۔ تبلیغی جماعت کا اجتماع ہوا تو یہ شخص مزدوروں کے ساتھ بڑی بڑی بلیاں کندھوں پر اٹھائے مزدوروں کے ساتھ کام میں منہمک کہیں کھدائی کا کام ہو رہا ہے تو یہ پھاوڑا لئے وہاں بھی کام میں جٹے ہوئے ہیں۔ اس طرح اپنی انتھک محنت اور ہر کام کو انجام دینے کی صلاحیت سے ہر کس و ناکس کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا کبھی انھیں شرم محسوس نہیں ہوئی۔ انھیں تمام خوبیوں اور صفات نے انھیں عوام اور خواص سب میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ماسٹر صاحب اس کی قدر نہ کر سکے۔ یا ان سے غلطیوں پر غلطیاں سرزد ہوتی رہی۔ اور انھوں نے اپنے کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کی یا پھر ہم بدل گئے لوگ بدل گئے اور عوام بدل گئے۔ اور یہ بدلاؤ ہماری سوچوں ہماری فکروں ہماری نیتوں و ہمارے جذبوں میں بھی اجاگر ہونا شروع ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی مدد و نصرت دھیرے دھیرے اٹھتی گئی۔ دلوں میں جو محبت اور انسیت تھی وہاں کدورتوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اور یہ سلسلہ رکا نہیں بلکہ دھیرے دھیرے اس میں اور اضافہ ہی ہوتا گیا۔ بالآخر جب ہماری نیک نیتی اخلاص و للّٰہیت پر دوسرے اور قسم کے اغراض نے غلبہ کر لیا تو رہی سہی خدا کی مدد و نصرت وہ بھی اٹھ گئی۔ اور یہ جرائیم ۱۹۸۶ء سے شروع ہوئے۔

جس کے نتیجہ میں ۱۹۸۸ء میں زبردست بحران اور مخالفت کا طوفان کھڑا ہوا۔ اس کے باوجود تمام کمزوریوں اور مخالفتوں کے بجز تھوڑے افراد کو چھوڑ کر عوام کی اکثریت کا پیار اور اعتماد پھر بھی ہم کو حاصل رہا۔ لیکن افسوس کہ آج ہمارے ماموں جان کہتے ہیں کہ "مسلمانوں سے زیادہ ہندو ہم پر اعتماد کرتے" (بحوالہ جدید مرکز مورخہ ۴ دسمبر ۹۴ء)

اور یہ بات ہم نے خود ان کی زبان سے بھی سُنی ہے۔

درمیان میں اس طرح کی باتوں کا تذکرہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اصل بگاڑ ۱۹۸۶ء سے شروع ہوا اور یہ داستان ابھی ۱۹۹۶ء تک ہی پہنچی ہے۔

آل انڈیا اقتصادی کونسل

۲۲ر فروری ۱۹۷۷ء کو جیل سے رہائی کے بعد ایمرجنسی کے ختم ہوتے ہی سکریٹری وصدر نے پھر بلا سودی اداروں کی کانفرنس وسمینار منعقد کیے جانے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اور اس سلسلے میں حضرت مولانا اسعد مدنی دامت برکاتہم سے صلاح ومشورہ وتبادلہ خیال کرنے کے بعد انہی کی ایما اور دعوت پر "مسلم فنڈ دیوبند" کے منیجر جناب حبیب صاحب نے دیوبند میں کانفرنس بلائی۔ جس کے نتیجہ میں ۱۹۷۸ء میں "آل انڈیا اقتصادی کونسل" کا قیام نہ صرف عمل میں آیا۔ بلکہ اس کے متعدد اجلاس۔ دیوبند، بمبئی، دہلی، بہرائچ اور نجیب آباد میں منعقد بھی ہوئے (بحوالہ ہفتہ وار ندائے ملت کا مضمون "آل انڈیا اقتصادی کونسل" کا قیام کیوں اور کیسے" مورخہ ۱۴ر جون ۱۹۸۱ء)

کونسل کے بمبئی۔ دیوبند اور بہرائچ کے اجلاسوں میں مجھے بھی شرکت کا شرف حاصل ہوا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ومرحوم مولانا اسحاق جلیس ندوی

۱۳ر مئی ۱۹۷۸ء کو مرحوم مولانا اسحاق جلیس ندوی ایڈیٹر سہ روزہ تعمیر حیات بہرائچ تشریف لائے اور انھوں نے میونسپل بورڈ کے سبزہ زار پر عوام کے ایک جلسہ کو خطاب کیا تو یہاں کی ملی امدادی سوسائٹی کو بھی بچشم خود دیکھنے کے بعد فرمایا کہ — دین تعلیم معاش اس تثلیث کو توحید میں ڈھال کر ملت مسلمہ دینی اور دنیوی فلاح وبہبود کا کام کرنے والے ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دیں گے۔ ملی سوسائٹی بہرائچ انھیں بنیادوں پر کام کر رہی ہے۔

اس طرح جب ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی ۲۴ر جون ۱۹۷۸ء کو بہرائچ تشریف لائے تو سوسائٹی کو دیکھنے کے بعد فرمایا کہ —" اس سے ہزاروں خاندانوں کا معاشی مسئلہ حل ہوا ہے اور یہ پرخلوص جدوجہد کرنے والوں کا عظیم کارنامہ ہے اور ملت کے لیے کام کرنے والوں کے لیے بہترین نمونہ ہو

مولانا علی میاں کا خط و سوسائٹی سے متعلق مولانا کے تاثرات

سوسائٹی سے متعلق مرحوم مولانا اسحاق جلیس ندوی و ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی نے جو تاثرات قائم کئے اس کے بارے میں مولانا علی میاں کو جب علم ہوا تو مولانا نے سوسائٹی کے صدر ماسٹر نعیم اللہ سے جب بھی وہ ملاقات اور بہرائچ کے لیے وقت مانگنے پہنچے۔ مولانا نے ہمیشہ سوسائٹی کے کام کی ستائش کی۔ اور ستمبر ۷۹ء کے اپنے مکتوب میں فرمایا کہ ــــ "آپ لوگ ملی سوسائٹی کے ذریعہ جو قابل قدر کام انجام دے رہے ہیں اس کی دل سے قدر ہے"۔ لیکن جب حضرت مولانا علی میاں ۱۲ر نومبر ۱۹۸۰ء کو بہرائچ تشریف لاتے ہیں تو تحریر فرماتے ہیں کہ ــــ "الحمد اللہ ملی امدادی سوسائٹی بہرائچ کی کارگزاری اور اس کی خدمات کا ذکر برسوں سے سنتا تھا۔ سوسائٹی کے ذمہ داروں و کارکنوں نے کئی بار بہرائچ آنے کی اور اس کے طریقہ کار اور اس کی پیش رفت کو قریب سے دیکھنے کی دعوت بھی دی لیکن ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ باوجود دلی قدردانی اور اس کی افادیت پر یقین کے یہ ناچیز اس سے پہلے وقت نہ نکال سکا۔ الحمد اللہ پندرہویں صدی ہجری کے بالکل ابتدا میں ۱۴ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۲ر نومبر ۸۱ء کو سوسائٹی کے ذمہ داروں کی دعوت پر جنھوں نے اس ادارے کے معائنہ اور اس کے کارکنوں کے ساتھ بیٹھنے اور معلومات کرنے کے علاوہ پیام انسانیت کے بڑے جلسہ کا انتظام بھی کیا تھا۔

سوسائٹی کے دفتر بیٹھ کر اور اس کے مختلف شعبوں کو بچشم خود دیکھ کر اس کی کارگزاری اور فیض رسانی کا گویا عینی مشاہدہ ہوا۔ میرا شروع سے خیال ہے کہ اس وقت ملک میں مسلمانوں کے باعزت طریقہ پر رہنے کی صورت یہی ہے کہ وہ جابجا ایسے ادارے قائم کریں جو مسلمانوں کو سود کی لعنت سے بچانے کے ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے کاروبار کرانے و مفید و موجب اجر کے کام کریں۔ اب ضرورت ہے کہ اسی نمونہ کی سوسائٹیاں ہندوستان میں جابجا قائم ہوں۔ میں نے ذمہ داروں سے استدعا کی ہے کہ اس کے لیے ملک کا دورہ کریں۔ جہاں کہیں ایسے ادارے قائم ہیں۔ ان کو دیکھیں اور ان کے تجربہ سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اپنے تجربات سے ان کو مستفید کریں۔ امید ہے کہ یہ ادارہ اور ترقی کرے گا اور اگر زندگی رہی اور دوبارہ آنا ہوا تو اس کو اور وسیع تر اور ترقی یافتہ دیکھ کر مسرت ہوگی۔

جلسہ پیام انسانیت و مقررین

مولانا کی آمد پر گھنٹہ گھر پارک میں ہونے والے پیام انسانیت کے جلسہ میں جن اہم شخصیتوں نے شرکت کی اور عوام کو خطاب کیا۔ ان میں مولانا علی میاں کے علاوہ ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی، سابق ممبر پارلیمنٹ پنڈت بدلو رام شکلا، سید ضرغام حیدر ایڈوکیٹ عرف مجن میاں۔ مسٹر دیودت شرما صدر مانو سماج، پنڈت رشی رام ترپاٹھی۔ مولانا کلیم اللہ نوری۔ مسٹر دھرم پال ایم ایل اے مسٹر نریندر سنگھ اشانت اور بابا گردمکھ داس بڑی سنگت بھرائچ۔

(بحوالہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۸۰ء)

مولانا کی تاثراتی تحریر کے بعد گھومنے اور سوسائٹیاں قائم کرنے کی جدوجہد کا آغاز

مولانا علی میاں کی اس تاثراتی تحریر کے بعد جہاں ایک طرف اترپردیش کے مختلف اضلاع میں سوسائٹیاں قائم کرنے کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ وہیں دوسری طرف سوسائٹی کے صدر و سکریٹری کو پورے ملک میں اس نہج پر کام کرنے والے تمام اقتصادی اداروں کو دیکھنے اور سمجھنے کا سندِ جواز حاصل ہو گیا۔ سندِ جواز کے حاصل ہونے کے بعد پھر کیا تھا۔ سفر پر سفر شروع ہوئے اور ملک کے کسی بھی کونے میں شاید ہی کوئی ایسا ادارہ ہو جس کو دیکھنے کا شرف حاصل نہ ہوا ہو۔ بعض سفروں میں بندہ بھی شریک رہا۔ درجنوں اضلاع میں سوسائٹیاں بھی قائم ہوئیں اور میرا خیال ہے کہ ۱۹۸۶ء تک تمام تر جدوجہد خواہ وہ سفر کی ہو یا مقام کی صدفی صد نیک نیتی، اخلاص للّٰہیت بے غرضی، بے لوثی کے جذبہ کے ساتھ مقصد اور صرف مقصد سے ہی کی گئی اور اخراجات میں بھی بہت ہی محتاطی[۱] اور کنجوسی کارفرما تھی اور ابتدا میں صدر و سکریٹری کے ساتھ سفر کرنا بھی

---

[۱] ماسٹر نعیم اللہ کی محتاطی اور کنجوسی کا تو حال یہ تھا کہ وہ سوسائٹی کے کسی کام سے لکھنؤ آتے تو میری سائیکل کا سہارا لیتے اور صفت یہ کہ کبھی ایسا بھی ہوا کہ اس پر دو سواری بٹھال کر خود سائیکل چلاتے اور وہ بھی سخت گرمی کے موسم میں۔ لیکن رکشہ کرایہ دینا گوارا نہیں کرتے تھے۔

کسی مجاہدہ سے کم نہیں تھا۔ اس لیے ہر کوئی ان کے ساتھ سفر کرنے کی ہمت بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک سکریٹری سید وصی الدین ہی تھے جو وہ ماسٹر صاحب کو جھیلتے تھے یا ماسٹر صاحب انہیں جھیلتے تھے۔ بعد کو حاجی امین بیگ و ماسٹر عبدالقدوس ان کے سفر کے ساتھیوں میں شامل ہوئے ان شخصیات کا تذکرہ ہم بعد میں کریں۔

لیکن ۱۹۸۶ء کے بعد وہ بات نہ رہی ہم میں بدلاؤ آگیا اور دھیرے دھیرے ہماری بے غرضی، بے لوثی، نیک نیتی، اخلاص وللّٰہیت میں کمی آنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مال کی چکا چوند اور سوسائٹی کی ترقی دیکھ کر ہم اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ ہمارا جذبہ سرد پڑنے لگا اور دھیرے دھیرے اس چکا چوند میں ہماری نظریں الجھنے لگیں۔ جہاں محتاطی اور کنجوسی کارفرما تھی وہاں شاہ خرچی نے جنم لے لیا اور پھر شروع ہو گیا روگ اور بیماری کا لامتناہی سلسلہ ہماری زبانوں کا مزہ بدلنے لگا۔ تو دل و دماغ کا بدلنا یقینی تھا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ جب ہم میں سچائی باقی نہیں رہی تو ہم نے سچائی کو سچائی کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا اور اس سے حیلہ و بہانے کا کام نکالا اور طرح طرح کی تاویلیں کر کے آپ نے آپ کو مطمئن کر لیا اور ۸۷ء سے ہم بالکل بگاڑ کی راہ پر چل پڑے۔

چوک بازار کی آراضی و ملی کامپلکس کی تعمیر

یہ آراضی حضرت مولانا علی میاں کی بھرائچ تشریف آوری سے قبل غالباً ۷۹ء میں ہی سوسائٹی نے چورانوے یا چھیانوے ہزار کی خرید لی تھی جس پر آج ملی کامپلکس اور ملی لاج قائم ہے۔ ۱۹۸۱ء میں ملی کامپلکس و ملی مارکیٹ کے تعمیری سلسلہ کی شروعات ہوئی اور جب زیر زمین تہہ خانہ کی سلیپ پڑنے لگی تو سوسائٹی مخالف عناصر کا وہ گروہ جو سوسائٹی کی ابتدا سے ہی اس تحریک کا مخالف تھا پھر سرگرم ہو گیا لیکن تعمیر بدستور جاری رہی۔ درمیان میں روپیہ کی کمی کے سبب تعمیری سلسلہ کو دو چار دن روکنا پڑا۔ لیکن چند دن کے بعد یہ تعمیری سلسلہ شروع

بھی ہو گیا کیونکہ لکھنؤ کے ایک صاحب خیر شخص (حافظ اکرام احمد خاں) نے کافی بڑا مالی تعاون بطور قرض سوسائٹی کو دے دیا تھا۔

حافظ اکرام احمد خاں صاحب

حافظ اکرام احمد خاں صاحب لکھنؤ کے ان صاحبِ خیر حضرات میں ہیں جنھیں لکھنؤ میں ہونے والی بیشتر کانفرنسوں و اجلاسوں کے مہمانوں و مندوبین کی طعام میزبانی کا شرف حاصل تھا اور وہ اس کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ان میں قوم و ملّت کے لیے بے حد جذبہ تھا وہ مسلمانوں کی معاشی و اقتصادی بدحالی و نیز مسلمانوں کو مہاجنوں کے استحصال سے بچانے کے لیے بلاسودی اداروں کے قیام کو نہ صرف ضروری قرار دیتے تھے بلکہ اس کی اہمیت و افادیت کے قائل تھے۔ اور یہی وہ نظریہ تھا جو "فلاحی بیت المال لکھنؤ" نام کی تنظیم کے قیام کا محرک بنا۔ جس کے وہ نہ صرف صدر تھے بلکہ بانی بھی تھے اور اس تنظیم کے کھاتہ میں جو بھی کچھ روپیہ تھا وہ ان کا اپنا ہی تھا۔ انھوں نے کئی ایک غریب مسلم لڑکوں کو جو ڈاکٹری امتحان پاس کے بعد اس میں داخلہ لینے اور اس کے تمام اخراجات برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ ان کے جوتے چپل، کپڑے سے لیکر فیس وغیرہ کے تمام اخراجات برداشت کر کے ان کی تعلیم مکمل کرائی۔ اس کے علاوہ وہ روزنامہ عزائم کے ایڈیٹر جمیل مہدی وہ ان کے اخبار کی بھی وقت ضرورت خاموش مدد کیا کرتے تھے۔ انھوں نے کچھ مسلم گرلس کالجوں کی سائنس لیبورٹری قائم کئے جانے میں بھی مدد دی۔ "فریدی جونیر ہائی اسکول لکھنؤ" کو محلہ سعادت گنج بازار خالہ کے نزدیک ایک بڑی آراضی بھی عنایت کی۔ سوامی وویکانند اسپتال کی معاونت میں بھی ان کا قومی ملّی جذبہ ہی

لہ حافظ صاحب کہتے تھے کہ ہماری قوم کے لوگ اسپتال دوا لینے ضرور جائیں گے اور جب وہ یہاں دیکھیں گے کہ اتنا بڑا اسپتال بن گیا ہماری قوم کے کسی فرد نے کوئی تعاون نہیں کیا ہے۔ تو اس سے ان کی سبکی ہو گی۔ دوسرے اگر یہاں اسپتال کے لوگ ہی انھیں دھتکار دیں تو کیا جواب؟ میں نے اسی نسبت سے اسپتال میں تعاون کیا ہے تاکہ یہاں کے لوگ ہماری قوم کا کچھ تو پاس و لحاظ رکھیں گے۔ آپ کے اور آپ کی بیگم کے نام کا پتھر اسپتال میں لگا ہوا ہے۔

کارفرما تھا۔ وہ غریبوں پریشان حالوں کی بھی مدد کیا کرتے تھے۔ وہ مرحوم علامہ عنایت اللہ مشرقی[1] کے بہت معتقد تھے اور خاکسار تنظیم کو آج کے حالات میں پھر زندہ کئے جانے کے متمنی تھے۔ ان کا تعلق مسلم لیگ سے بھی تھا اور ابراہیم سلیمان[2] سیٹھ کے صدر درجہ قدر داں تھے۔

یہ مختصر تعارف ہے اس شخصیت کا جس نے ملی کامپلکس کی تعمیر میں اس وقت معاونت کی۔ جبکہ اس کی تعمیر روپیہ کی کمی کے سبب رک گئی تھی۔ دھیان رہے ۲۳ فروری ۱۹۸۰ء کو حافظ اکرام احمد خاں صاحب جناب ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ کے ہمراہ خاص طور سے سوسائٹی کو دیکھنے اور اس کی کارگزاری کا عینی مشاہدہ کرنے کی غرض سے بہرائچ تشریف لاچکے تھے۔ اس لئے وہ سوسائٹی کی کارگزاری سے بے حد متاثر تھے۔ اور لکھنؤ میں ملی سوسائٹی قائم کرنے کے خواہش مند تھے۔ حافظ صاحب کی اس معاونت سے سوسائٹی مخالف عناصر مایوسی کا شکار تو ضرور ہوئے۔ لیکن ان کی سرگرمیاں بہرائچ کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں بھی بڑھنے لگیں اور ان عناصر نے تحریری اور زبانی ہر طرح حافظ اکرام احمد خاں و ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ کو سوسائٹی کے خلاف بددل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور تعمیری سلسلہ بدستور جاری رہا۔ لیکن جب مارکیٹ تعمیر ہو گئی اور باوجود تمام کوششوں کے وہ نہ چل سکی۔ تو حافظ صاحب نے دوسروں کے کان بھرنے پر روپیہ کی شدت سے مانگ شروع کر دی نتیجہ میں ان کا کل روپیہ واپس کر دیا گیا۔ حافظ صاحب کو اتنی جلدی روپیہ ملنے کی امید نہیں تھی۔ لیکن روپیہ مل جانے کے بعد ان کے دل میں سوسائٹی اور اس کے متعلقین و صدر ماسٹر محمد نعیم اللہ کی قدر و عزت نہ صرف بڑھ گئی بلکہ اعتماد و یقین بھی پختہ ہو گیا اور یہی چیز لکھنؤ میں ملی سوسائٹی کے قیام کا محرک بنی۔

---

[1] بانی خاکسار تحریک جو غالباً ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی۔

[2] مسلم لیگ کے سابق صدر و ممبر پارلیمنٹ اور اب انڈین نیشنل لیگ کے صدر ہیں۔

ضلع انجمن تعلیمات دین اور ماسٹر نعیم اللہ

غالباً ۱۹۷۸ء یا ۱۹۷۹ء میں مرحوم مولانا محمود الحسن صاحب ناظم دینی تعلیمی کونسل کی آمد پر مسجد عالم شہید سے ملحقہ ہال کی چھت پر کمیٹی انجمن تعلیمات دین کی تشکیل تو ضرور ہوئی تھی لیکن کام سوسائٹی کے ذریعہ ہی انجام پاتا رہا کیونکہ ماسٹر صاحب سوسائٹی کے صدر کے علاوہ انجمن کے بھی سکریٹری تھے۔ غالباً ۱۹۸۰ء کے اوائل سے آرگنائزروں کی تعداد دو سے بڑھ کر چار ہو گئی۔ ضلع میں نئے اور پہلے سے قائم شدہ مدارس و مکاتب کی مجموعی تعداد تقریباً سوا تین سو کے اوپر پہنچ چکی تھی۔ جن میں اکیاسی مکاتب کا الحاق ضلع انجمن سے ہو چکا تھا۔ تحصیل بھنگا میں اکرام الحق صاحب۔ قیصر گنج میں عبد الرحمٰن اور تحصیل نانپارہ میں وحید الدین ارگنائزر مقرر تھے اور یہ آرگنائزر صرف اور صرف ماسٹر صاحب کی ہی رہنمائی میں کام کرتے تھے۔ جن کی تنخواہوں کا بوجھ اگر صرف ملی سوسائٹی یا انجمن اٹھاتی تو بات سمجھ میں آتی تھی۔ لیکن مسلم مسافر خانہ بہرائچ اور وقف درگاہ شریف اٹھائے تو یہ بات جہاں سمجھ سے بالاتر تھی وہیں یہ اس بات کا ثبوت بھی تھی کہ ان اداروں کے ذمہ داروں کو اگر ماسٹر صاحب پر اعتماد نہ ہوتا تو ان ہی کی پیش کردہ تجویز و درخواست کو وہ کیونکہ قبول کرتے۔ اور ان اداروں نے ان کی درخواست کو بخوشی قبول کر لیا اور بڑی حد تک دونوں نے ایک دوسرے کو نبھایا بھی۔ "لیکن افسوس ہے کہ .....

آج وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے زیادہ ہندو ہم پر بھروسہ کرتے ہیں"

۱۹۸۱ء کی مردم شماری

۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں ماسٹر صاحب نے ضلع کی سطح سے لیکر تحصیل اور بلاک کی سطح پر نہ صرف کمیٹیاں بنوائیں بلکہ گاؤں گاؤں، دیہات دیہات اور قصبہ قصبہ میں میٹنگیں کرا کے صحیح مردم شماری کرائے جاتے اور زبان کے خانہ میں اردو لکھائے جانے کی جو تحریک چلائی۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہرائچ اردو ضلع قرار پایا اور اس تحریک میں انجمن تعلیمات دین کے مقامی آرگنائزروں نے ماسٹر صاحب کی پلاننگ کے مطابق کافی کچھ محنت صرف کی جو ذیل کی رپورٹ سے واضح ہے۔

"ملی سوسائٹی کے صدر ماسٹر نعیم اللہ کے پروگرام کے مطابق ضلع کی مردم شماری میں انجمن تعلیمات دین کے مقامی آرگنائزروں نے تحصیل اور بلاک کی سطح پر گاؤں، قصبات اور دیہات میں مادری زبان اردو لکھائے جانے کی جو مہم چلائی اور جس طرح اس قومی، ملی اور ملکی خدمت کے کام کی نگرانی کی اور اس میں جو تعمیری رول ادا کیا اسی کا نتیجہ ہے کہ بہرائچ اردو ضلع کی فہرست میں شمار ہو گیا" (بحوالہ ندائے ملت ۱۳ دسمبر ۸۱ء)

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے سلسلے میں بہرائچ کے علاوہ مختلف اضلاع میں بھی ماسٹر صاحب نے نہ صرف میٹنگیں کیں۔ بلکہ پمفلٹ، اشتہار کے ذریعہ بھی ایک مہم چلائی اور اخبارات کے ذریعہ اپیلیں بھی کیں۔

پانچویں ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس

۲۹ نومبر ۱۹۸۱ء کو مولانا علی میاں کی صدارت میں اتر پردیش "دینی تعلیمی کونسل" کی میٹنگ لکھنؤ میں ہوئی اور بہرائچ کی دعوت کو منظوری مل گئی۔ اور طے ہو گیا کہ ۱۹۸۲ء میں کانفرنس بہرائچ میں ہو گی اس طرح اس دو روزہ عظیم الشان کانفرنس کی تاریخ ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۸۲ء بمقام آزاد انٹر کالج نہ صرف مقرر ہو گئی بلکہ کانفرنس کی صدارت کے لیے حضرت مولانا علی میاں اور افتتاح کے لیے سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی منظوری بھی مل گئی۔

ملی کامپلکس کی تعمیر کے سلسلے میں غلط فہمیوں وافواہوں کو دور کرنے میں ندائے ملت کا رول

میں پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ ۱۹۸۱ء میں ملی کامپلکس و ملی مارکیٹ کے تعمیری سلسلے کی شروعات ہوئی اور جب زیر زمین تہہ خانہ کی سلیب (چھت) پڑنے لگی تو سوسائٹی مخالف عناصر کا وہ گروہ جو ابتدا ہی سے سوسائٹی اور اس تحریک کا مخالف تھا پھر سرگرم ہو گیا۔ اس مخالفت میں کچھ نام نہاد دیندار بھی شامل ہو گئے اور شروع ہو گیا تعمیر کے خلاف ڈھیر سے ڈھیرے پروپیگنڈہ اور یہ پروپیگنڈہ اس حد تک کیا گیا اور عوام کو اس حد تک ورغلایا گیا کہ سوسائٹی

بحرانی کیفیت سے دوچار ہونے کے قریب تک پہنچ گئی۔ کیونکہ جمع شدہ پونجی کی کافی کچھ رقم زمین کی خریداری اور پھر اس پر بلڈنگ کی تعمیر میں صرف ہو چکی تھی۔ ڈر تھا کہ سوسائٹی کسی وقت بحرانی کیفیت سے دوچار نہ ہو جائے۔

ذیل کی تحریر سے اس وقت کی صورت حال کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

"ملی امدادی سوسائٹی" کی زیر تعمیر پانچ منزلہ عمارت کیوں اور کیسے بن رہی ہے؟

یہ سوال ضلع کے عوام میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں کو اس کی تعمیر میں پٹرو ڈالر نظر آرہا ہے اور کچھ لوگ عوام میں یہ پروپگنڈہ کر رہے ہیں کہ ملی سوسائٹی کے لوگ سود کھا رہے ہیں کچھ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ عمارت سود کی رقم سے بن رہی ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ کھاتہ داروں کی جو رقم بنیک میں جمع ہوتی ہے اس پر کافی سود مل رہا ہے اور یہ سود اس عمارت میں لگایا جارہا ہے اس طرح کی افواہیں وہ لوگ اڑا رہے ہیں جنھوں نے کبھی بھی سوسائٹی کے ساتھ تعاون نہیں کیا اور نہ کبھی انھوں نے سوسائٹی کے طریقہ کار کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی۔

حالانکہ جو لوگ سوسائٹی سے قرض لیتے ہیں انھیں قرض فارم خریدنا پڑتا ہے اس فارم سے جو آمدنی ہوتی ہے اس سے ملازمین کی تنخواہ لاکر کرایہ، دفتر کرایہ، بجلی و اسٹیشنری کے تمام اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ اس وقت سوسائٹی میں جو عملہ کام کر رہا ہے اس کی تنخواہ پر ہر ماہ تقریباً تین ہزار روپیہ صرف ہوتا ہے، اسٹیشنری، بجلی، دفتر و لاکر کرایہ وغیرہ سب ملاکر ایک ہزار روپیہ ماہانہ کا خرچ الگ ہے۔ جمع شدہ سوسائٹی کے روپیہ پر جو سود بنیک سے ملتا ہے وہ نادار، یتیم، پریشان حال لوگوں کو دے دیا جاتا ہے۔ جس کے دینے میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ جہاں تک سوسائٹی میں دعوتیں اور کھانے پینے کی بات ہے اور جس کے متعلق بھی طرح طرح کی باتیں کہی جارہی ہیں۔ ان کھانے پینے[1]

---

[1] کھانے پینے و دعوتوں کی پہلے ہی ترتیب تھی ۱۹۸۶ء کے بعد پھر کوئی ترتیب نہیں رہی جس مد سے چاہا دعوت کر ڈالی اور جہاں چاہا وا ؤچر لگا دیا۔

اور دعوتوں کا سوسائٹی کے روپیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجلس عامہ جس کے ممبران کی تعداد تقریباً ۴۲ ہے اور جو دو روپیہ ماہانہ چندہ رکنیت دیتے ہیں۔ اس سے مہمانوں کی ضیافت کا انتظام ہوتا ہے۔

زیر تعمیر پانچ منزلہ عمارت جس کے بارے میں بہت زیادہ افواہیں گرم ہیں ان لوگوں کے تعاون سے بن رہی ہے جن کو خدا نے ملت اور قوم کا کچھ درد دیا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو قوم کی پسماندگی اور زبوں حالی پر نہ صرف سوچتے اور کڑھتے ہیں بلکہ اپنی کوشش اور وسعت بھر قوم کے لیے کچھ کر گذرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، خواہ ان کی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے ہی لوگوں نے ایک سو روپیہ سے لیکر جتنا جو کچھ جس سے بن پڑا سوسائٹی کی تعمیر میں سوسائٹی کو بہ طور قرض تعاون دیا ہے اب تک جتنا روپیہ اس تعمیر میں لگ چکا ہے اور جو کچھ لگ رہا ہے وہ سب سوسائٹی کو ادا کرنا ہے۔ یعنی سوسائٹی ان کی مقروض ہے۔ جنھوں نے بطور قرض تعاون دیا ہے۔ اور یہ قرض سوسائٹی دو کانوں اور بلڈنگ سے ہونے والی آمدنی سے ادا کرے گی۔ دھیان رہے سوسائٹی میں کسی قسم کے چندے کی کوئی مد نہیں ہے اور ابتدا سے اب تک سوسائٹی نے کسی قسم کا کوئی چندہ نہیں لیا اور نہ زیر تعمیر پانچ منزلہ عمارت کے لیے کسی قسم کا کوئی چندہ ہوا جو اس میں لگا ہو۔ جتنی بھی رقم اس تعمیر میں لگی ہے وہ سب کی سب قرض کے طور پر حاصل کی گئی ہے۔ ضلع میں مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد آباد ہے اور خصوصاً شہر میں کم و بیش تقریباً اسّی ہزار مسلمانوں کی آبادی ہے۔ پھر بھی ان میں صرف سات ہزار ہی ایسے لوگ ہیں جو سوسائٹی کے کھاتہ دار بن کر سوسائٹی کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ اور یقیناً سوسائٹی کے ساتھ سب سے زیادہ تعاون ان غریب کھاتہ داران ہی کا ہے۔ جن کے پانچ دس روپیہ کھاتہ کھلنے پر ہی ادارے کا نہ صرف وجود ہوا بلکہ ان ہی کی معاونت سے ادارہ نے ترقی کی اور زیر تعمیر پانچ منزلہ عمارت میں بھی ان کا زبردست تعاون شامل ہے۔ حالانکہ ابھی ہزاروں لوگوں کے کھاتہ کھلنے باقی ہیں۔

جو لوگ افواہ اڑا رہے ہیں ان کے لیے یہ بات تعجب خیز ہوگی کہ ضلع کے باہر کی ایک اہم شخصیت نے اس تعمیر میں چالیس ہزار روپیہ کا تعاون بطور قرض سوسائٹی کو دیا ہے ....

اس کے باوجود بعض لوگوں کی طرف سے غلط فہمی پھیلائی جا رہی ہے۔ لوگ سوسائٹی کے دفتر میں آکر اپنے شکوک رفع کر سکتے ہیں تاکہ خوامخواہ محض ناواقفیت میں کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے اس تعمیری کام کو نقصان پہنچ جائے۔

(بحوالہ ندائے ملت بعنوان "بہرائچ ملی امدادی سوسائٹی آزمائش میں")

۷ فروری ۱۹۸۲ء

ایڈیٹر ندائے ملت کے نام تین اہم مراسلات

مراسلہ نمبر ۱۔ مکرمی۔ بہرائچ ملی سوسائٹی کی پانچ منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر جب سے کام شروع ہوا تب ہی سے سوسائٹی کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑیں اور عوام میں غلط فہمیاں پھیلنی شروع ہوئیں اس غلط فہمیوں کو پھیلانے میں جہاں مخالفین کی افواہ بازی کا ہاتھ تھا وہیں دوسری طرف سوسائٹی کے ذمہ داران کی خاموشی غفلت اور بے توجہی کی بھی کارفرمائی تھی۔ کیونکہ جب بھی کسی نے تعمیر کے بارے میں پوچھا کہ یہ کیسی بن رہی ہے۔ کچھ نے تو کہا کہ ہم نہیں جانتے اور کچھ نے یہ کہا کہ جان کر کیا کروگے حالانکہ جن سے پوچھا گیا ان سب کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت میں سوسائٹی کی مجلس عام اور مجلس منتظمہ سے ہی تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگوں نے سوسائٹی کے صدر وسکریٹری سے اس تعمیر کے بارے میں پوچھا۔ تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ کیسے بن رہی ہے۔ اس طرح کی گول مول باتوں سے پوری طرح عوام میں شکوک وشبہات پیدا ہونا لازم تھا۔ اور مخالفین ان گول مول باتوں سے پوری طرح سمجھ گئے کہ یقیناً سوسائٹی کے لوگ گڑبڑ کر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ کاش یہ وضاحت جو آج ہوئی بہت پہلے کی جاتی تو ہم جیسے لوگ غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ بہرحال اس ملی ادارے کے بارے میں غلط فہمی کی بنیاد پر ہم نے جو کہا سنا ہے اس سب کی ذمہ داری سوسائٹی ہی کے لوگوں کے سر جاتی ہے۔ ہم آپ کے بیحد ممنون ہیں کہ آپ نے بر وقت اس طرح کا مضمون شائع کر کے ہمارے اندر پھیلے شکوک وشبہات کو رفع کیا خدا کرے آپ کا اخبار اور زیادہ مقبول ہو۔

(بابو بشیر الدین چھوٹی بازار بہرائچ)

مراسلہ نمبر۲۔ مکرمی بہرائچ ملی سوسائٹی آزمائش میں مضمون پڑھا اس مضمون میں سوسائٹی کے متعلق پھیلی غلط فہمیوں کی جس طرح وضاحت ہوئی ہے۔ اس سے اصلیت کا پتہ چلتا ہے کہ سوسائٹی کے لوگ کس طرح کام کر رہے ہیں کیونکہ ضلع میں جس طرح سود لینے اور کھانے کی افواہیں پھیلائی جارہی تھیں اس سے خود ہمارے ذہن میں بھی سوسائٹی اور سوسائٹی کے ذمہ داران کے متعلق نفرت کے بیج پرورش پانے لگے تھے اور اگر یہ مضمون شائع نہ ہوتا تو ہم سوسائٹی سے اپنا کھاتہ ختم کرنے کے نتیجہ پر پہنچ چکے تھے۔ ہم آپ کے اخبار اور مضمون نگار کے بے حد مشکور ہیں کہ اس قومی ملی ادارے کے متعلق ہماری غلط فہمیوں کو دور کیا۔

محمد عظیم محلہ قلعہ بہرائچ

مراسلہ نمبر۳۔ مکرمی آپ کے ۷ر فروری کے شمارہ میں بہرائچ سوسائٹی کے بارے میں مضمون پڑھا خصوصاً پانچ منزلہ عمارت کی تعمیر کیوں اور کیسے ہو رہی ہے اس کی وضاحت بہت ضروری تھی۔ دل ودماغ میں پیدا ہونے والی تمام تر غلط فہمیاں اس وضاحت سے دور ہوئیں اور یہ جان کر تعجب ہوا کہ اس تعمیر میں چالیس ہزار روپیہ کا تعاون بطور قرض لکھنؤ کے ایک صاحب نے کیا ہے۔

یقیناً ملی سوسائٹی کے لوگ صحیح نہج پر کام کر رہے ہیں اگر صحیح نہج پر کام نہ کرتے ہوتے تو چالیس ہزار اس طرح کوئی نہ دیدیتا۔ خدا کرے یہ بات دوسروں کی بھی سمجھ میں آجائے۔

رفیق احمد (سکریٹری)

(مدرسۃ البنات قاضی پورہ بہرائچ)

(بحوالہ ندائے ملت ۲۴ر فروری ۱۹۸۲ء)

پانچویں ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس کی تیاری اور اختلافات کی ابتدا

مقررہ تاریخ جیسے جیسے قریب آتی گئی کانفرنس کی تیاری بھی زور شور سے شروع ہو گئی۔ تیاریوں کے ساتھ ساتھ تلخیوں اور اختلافات کے بیج بھی پڑنے شروع ہو گئے۔ دلوں میں جو آپسی انسیت ومحبت، اتحاد واتفاق تھا۔ وہاں بغض، کینہ، حسد وکدورتوں نے جنم

لینا شروع کر دیا۔ اور اس صورت حال کے پیدا کرنے میں جہاں دوسروں کی اپنی کچھ کمزوریوں اور خامیوں کا دخل تھا۔ اس سے کہیں زیادہ ماسٹر صاحب کے ہٹلر شاہی لب و لہجہ و طرز عمل کا دخل

لہ کانفرنس کے موقع پر سید حامد صاحب کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ پروگرام شروع ہونے کے چند سکنڈ بعد کچھ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ سید وصی الدین نے کچھ عورتوں کو واپس پہنچانے کی غرض سے جیپ کہیں قریب بھیج دی اور سکریٹری صاحب نے جیپ یہ دھیان رکھ کر بھیجی تھی کہ سید حامد صاحب کو فوری جانا ہے۔ لیکن ان کا پروگرام وقت سے کچھ پہلے ہی ختم ہو گیا۔ پروگرام ختم ہوتے ہی حامد صاحب باہر آ گئے اور بمشکل دو تین منٹ (یہ بھی کچھ زیادہ ہے) اس سے بھی کم وقت گذرا ہوگا کہ ماسٹر صاحب کا پارہ چڑھ گیا اور انھوں نے وصی صاحب کو اس طرح ڈانٹ پلانی شروع کر دی کہ جیسے کوئی اپنے چپراسی کو ڈانٹ رہا ہو۔ مجھے بھی ان کے اس طرز عمل سے شدید تکلیف پہنچی لیکن میں اس وقت خاموش رہا کہ اتنے میں جیپ آ گئی۔ جب وہ تھوڑا نرم پڑے تو میں نے تھوڑی دیر کے بعد ماسٹر صاحب سے کہا کہ وہ بھی سکریٹری ہیں اور آپ کو اتنا گرم نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میرے اس طرح کہنے کے بعد ان کو احساس تو ضرور ہوا۔ لیکن یوں اور یوں . . . . کہہ کر بات ختم کر دی کانفرنس کے موقع کے علاوہ اس طرح کے کئی ایک واقعات وصی صاحب کے میرے سامنے رونما ہوئے۔ لیکن مہمان ہے وہ شخص کہ اس نے کبھی کسی بات کو (PRESTIGE ISSUE) پرسٹیج ایشو نہیں بنایا اور ادارے کے مفاد کو سامنے رکھ کر نظریاتی اور طریقہ کار کے اختلافات کے باوجود ماسٹر صاحب کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کام کرتا رہا۔ جہاں تک قربانی کی بات ہے اس شخص نے بھی کوئی کم قربانی نہیں دی ہے اس کی مجبوری صرف یہ تھی کہ وہ سرکاری ملازمت میں کلرک اور بابو تھا۔ اگر وہ بھی ماسٹر صاحب کی طرح ماسٹر اور ماسٹروں کا لیڈر ہوتا۔ تو وہ بھی اتنا ہی وقت صرف کرتا جتنا ماسٹر صاحب صرف کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ بھی دیوانگی کی حد تک سوسائٹی سے وابستہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں حوصلہ ہمت و جرأت تو اتنی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی ان میں بہت سی خوبیاں تھیں اور وہ ادارے کے لیے مفید و موثر آدمی تھے۔

نہ زیادہ رہا۔ مجھے ماسٹر صاحب کا وہ جملہ آج بھی یاد ہے جو انھوں نے عبدالجبارؒ راعینی و ماسٹر عبدالقدوسؒ و دیگر کچھ حضرات کے سامنے انجمن تعلیمات دین کے کام کے سلسلے میں ہی کہا تھا کہ — "کام میں کرتا ہوں مشورہ کس سے لوں" اور اس جملہ کے ادا کرنے میں ان کا جو انداز و لب لہجہ تھا وہ یقیناً زعم سے بھرا ہوا تھا۔ یہی وہ بنیادی روگ تھا جس سے ان کے اندر "میں اور ہمؒ" کے جراثیم پیدا کئے۔ اور اس جراثیم کے نتیجہ میں ان میں اکڑ پن دھیرے دھیرے پیدا ہونا شروع ہو گیا پھر لوگ بھی دھیرے دھیرے اندرونی طور پر بددل ہونے شروع ہو گئے۔ مرض دھیرے دھیرے جڑ پکڑتا چلا گیا اور ۱۹۸۷ء تک اس نے ایک مستقل روگ کی شکل اختیار کر لی۔ جہاں تک کانفرنس کی بات ہے کانفرنس بے حد کامیاب رہی لیکن کانفرنس ختم ہوتے ہی تلخیوں اور اختلافات نے اپنا اثر اس حد تک دکھایا کہ انجمن ٹوٹ گئی۔ ماسٹر صاحب نے اپنے آپ کو اس سے الگ کر لیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جو دینی تعلیمی کونسل کے ذمہ داروں میں سے تھے ان سے بھی ماسٹر صاحب کی تلخیاں بڑھیں۔ مرحوم نظام الدین خاں ایڈوکیٹ جو اس وقت ضلع انجمن تعلیمات دین کے صدر تھے ان سے بھی اختلافات پیدا ہوئے ان اختلافات کے نتیجہ میں انجمن کا کام برائے نام رہ گیا اور دھیرے دھیرے آثار گنائمز بھی نہیں رہ گئے۔ کیونکہ جب کام کرنے والے نے کام کے زعم میں اپنے آپ کو اس سے الگ کر لیا تو انجام بھی یہی ہونا تھا۔ حالانکہ ماسٹر صاحب اس وقت نیک نیت تھے۔ مخلص تھے ان میں کسی قسم کی اغراض پسندی کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ ہاں ان کے کام کے طریقہ کار سے کچھ لوگوں کو ضرور اختلافات رہا۔ لیکن وہ اختلاف رکھنے والوں کی نظر میں بھی معزز و محترم رہے اور اس وقت ماسٹر صاحب کی شخصیت آج کے ایسی نہیں تھی کہ ہر کس و ناکس ان پر انگلی اٹھا رہا ہو۔

لے ملی سوسائٹی کی مجلس عامہ کے رکن تھے۔

لے سوسائٹی کے جوائنٹ سکریٹری تھے

لے کسی جماعت میں اگر افراد یہ رخ (ہوں تو میں ہوں میرے سوا کوئی نہیں) اختیار کر لیں تو سمجھ لیجئے کہ اب اس کا شیرازہ بکھرنے میں کوئی دیر نہیں۔ کیونکہ جماعت ادارے یا تنظیم کی کامیابی فرد کی بے نفسی پر مبنی ہے۔

کیونکہ وہ حقیقی معنوں میں وہ نیک نیت تھے اور باوجود کچھ کمزوریوں کے بھی عوام اور خواص میں مقبول اور محبوب تھے۔ لیکن ان کی اپنی ہٹلر شاہیت نے انھیں دھیرے دھیرے کمزور کر دیا۔

مولانا محمد عظیم خاں کی بے دخلی

مولانا محمد عظیم خاں مدرسہ نور العلوم میں استاد تھے۔ نہایت ہی مخلص و نیک طبیعت تھے۔ مزاج میں غصہ اور جذباتیت زیادہ تھی۔ ان کی حیثیت سوسائٹی کے بنیادی پتھر کی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ بحیثیت مینیجر سوسائٹی میں کام کیا۔ لیکن شیطان کا ان پر بھی چکر چل گیا انھوں نے کوئی بے ایمانی تو نہیں کی۔ لیکن ان سے کچھ غلطیاں ضرور سرزد ہوئیں۔ جس کی پاداش میں انھیں سوسائٹی سے ۱۶ فروری ۱۹۸۳ء کو بے دخل ہونا پڑا۔ اس بے دخلی کے بعد انھوں نے سوسائٹی کا چارج دینے و چابی دینے میں جو طریقہ کار اپنایا وہ نہایت ہی افسوس ناک تھا۔

کلرک بابو حنیف کا فراڈ

سوسائٹی میں بابو حنیف صاحب ایک کلرک تھے۔ نہایت تیز حاضر جواب اور چرب زبان۔ انھوں نے دو ڈھائی سال غالباً سوسائٹی میں کام کیا اور لیجر کھاتوں میں ہیرا پھیری کرکے رقم لے کر استعفیٰ دے کر چلے گئے۔ بعد کو چیکنگ میں یہ معاملہ پکڑا گیا۔ تو ماسٹر صاحب وصی صاحب فنگر ایکسپرٹ مسٹر سنہا کے پاس مع لیجر کھاتوں کے ہلواسیہ مارکیٹ حضرت گنج لکھنؤ پہنچے۔ ساتھ میں میں بھی موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ بابو حنیف صاحب کا یہ کارنامہ ہے۔ قانونی کاروائی کے بارے میں بات کی گئی تو خرچ بہت زیادہ تھا۔ اس لیے معاملہ کو آگے بڑھانا غیر مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اس طرح اس نقصان کو کسی نہ کسی طرح برابر کیا گیا۔

سوسائٹی کا ۱۹۸۳ء کا بحران

مولانا محمد عظیم خاں کی بے دخلی کے بعد مارچ ۱۹۸۳ء میں سوسائٹی بحران سے دوچار ہو گئی اس بحران میں صدر و سکریٹری کے علاوہ دیگر اراکین اور مخلصین سبھی پریشان تھے اور ہر ایک

اپنی کوشش بھر جو کچھ جس سے ہو پا رہا تھا کر رہا تھا۔ لیکن بحیثیت ذمہ دار کے ماسٹر صاحب
کچھ زیادہ ہی پریشان تھے۔ اسی غرض سے انھوں نے لکھنؤ کا سفر بھی کیا اور جب کوئی سبیل
کسی طرح بنتی نظر نہیں آئی تو انھوں نے بحالت مجبوری حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم سے
دست سوال دراز کئے جانے کا من بنایا۔ میں نے بہت چاہا کہ مولانا سے اس قسم کی بات نہ
کی جائے۔ لیکن ماسٹر صاحب باوجود سمجھانے اور منع کرنے کے کسی طرح تیار نہیں ہوئے
بہت کہنے کے بعد ماسٹر صاحب نے زبانی بات کرنے کے بجائے خط لکھنے کا من بنا لیا اور
مولانا کے نام خط لکھ ڈالا خط لکھنے کے بعد وہ مولانا کو دینا چاہتے تھے۔ جبکہ میں چاہتا تھا کہ
ماسٹر صاحب کو اس سے باز رکھا جائے۔ بالآخر میں نے ماسٹر صاحب سے یہ کہہ کر خط حاصل
کر لیا کہ ہر چیز کا ایک موقع ہوتا ہے۔ یہ موقع خط دینے کا نہیں ہے۔ ایسے دینے سے کیا
فائدہ کہ کام بھی نہ بنے اور اپنی سبکی ہو۔ آپ خط دے دیں مجھے میں موقع محل دیکھ کر خط ان
تک پہونچا دوں گا۔ اور جو کچھ کہنا ہوگا کہہ بھی دوں گا۔ اللہ کا کرنا یہ کہ بات سمجھ میں آ گئی
اور خط انھوں نے مجھے دے تو دیا۔ لیکن اس خط کے بارے میں ماسٹر صاحب نے دو بار مقبول
صاحب سے کہلایا کہ شمیم سے کہہ دو کہ کسی طرح موقع نکال کر وہ خط مولانا تک پہنچا دیں کیوں کہ
سوسائٹی کے حالات اس وقت تک سدھرے نہیں تھے۔ بہر حال میری سمجھ میں جو بات نہیں آ رہی
تھی۔ میں وہ کیسے انجام دیتا؟ خط نہ پہنچا کر میں نے بہتر ہی کیا کیونکہ میرا پختہ خیال تھا کہ مولانا سے
کام تو نہیں بنے گا الٹے اپنی وقعت کم ہوگی اور سبکی الگ ہوگی۔ کیونکہ مولانا سے ربط و تعلق (بالکل
نیا نیا ہی قائم ہوا تھا) اور تعلق کی بات بالکل ابتدائی مرحلہ کی تھی۔ ایسی صورت میں دست سوال
دراز میری سمجھ سے مناسب نہیں تھا اور یہی چیز مجھے خط دینے میں مانع ہوئی۔

علی میاں کے نام ماسٹر صاحب کا خط جسکو میں نے نہیں پہنچایا

محترم و مکرم جناب حضرت مولانا علی صاحب دامت برکاتہم السلام وعلیکم۔

عرصہ کے بعد ہفتہ میں دوبارہ زیارت نصیب ہوئی۔ بہرائچ کے حالات کے بارے
میں خصوصی توجہ چاہتا ہوں۔ زبانی مطلع کیا تھا کہ کچھ تخریبی عناصر نے ملی امدادی سوسائٹی پر
ایک مقدمہ قائم کر کے عوام میں بدنام کرنے کی جدوجہد شروع کر رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے

کھاتہ داران نے تنظیم سے خاصی رقم نکال لی ہے۔ قانونی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ مالی پریشانی بھی شدید ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے قرض کا اجرا گیارہ سال کی مدت میں پہلی بار پندرہ یوم سے بند کردینا پڑا ہے۔ جبکہ امسال بہرائچ میں شدید ترین سیلاب کی وجہ سے عوام پریشان ہیں۔ ایسے وقت میں قرض کا بند ہونا عوام کی پریشانیوں میں اضافہ ہوگا۔ التماس ہے کہ اگر حضرت کے کہنے پر کچھ کھاتہ داران کی رقمیں جمع ہوجائیں یا کسی نہ کسی ذرائع سے کم سے کم ایک لاکھ روپیہ بطور قرض صرف ایک سال کی مدت کے لیے مل جائے تو انشاء اللہ کام حسن اسلوبی سے چل جائے گا پریشانی کے اسباب ایک طرف اگر سیلاب تھا دوسرا غلط پروپیگنڈہ تیسرے سات لاکھ کا سرمایہ ملی کامپلکس کی عمارت میں خرچ ہوتا ہے۔ ایک ہفتہ کے اندر ڈھائی لاکھ روپیہ نکل گیا۔

دوئم پندرہ یوم قبل بہرائچ کے جنوب میں رنکی پورہ گاؤں کی خالص مسلم آبادی کے ۶۶ گھروں کو وہاں کی اکثریت آبادی نے منظم سازش کے تحت لوٹ کر آگ لگادی ہے۔ کچھ بھی سرکار کی امداد پہنچائی گئی مزید امداد ضرورت ہے۔ دونوں باتوں کے لیے دعاؤں کی ضرورت ہے۔

فقط

دعاؤں کا طالب

احقر

محمد نعیم اللہ صدر ملی امدادی سوسائٹی

مورخہ ۹ مارچ ۱۹۸۳ء بہرائچ

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ۱۹۸۳ء کا بحران کس نوعیت کا رہا ہوگا۔

ملی لاج و کمپلکس کا افتتاح

غالباً۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو ضلع مجسٹریٹ بہرائچ مسٹر پنکج کمار کے ہاتھوں رسم افتتاح ہوا۔ اس افتتاحی تقریب میں شہر کے ممتاز علماء، دانشور، سماجی و تعلیمی اداروں کے سربراہان اور مختلف طبقوں اور مذاہب کے معزز شہریوں نے "ملی امدادی سوسائٹی" کے کارناموں پر زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ سوسائٹی کے سکریٹری سید وصی الدین نے تقریب کی نظامت کرتے ہوئے سوسائٹی کے اغراض و مقاصد اور موجودہ تعمیر کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور

معززین کو دعوت فکر و نظر دی۔ سوسائٹی کے صدر ماسٹر نعیم اللہ نے بتایا کہ ملی امدادی سوسائٹی نے اپنے گیارہ سالہ مدت قیام میں غریب اور کمزور طبقہ کو بلاسودی قرضہ فراہم کرکے انھیں اپنے کاروبار کے فروغ اور روزانہ کی زندگی کو گزارنے میں مالی تعاون دیا ہے۔ سوسائٹی نے اپنا کام چھ روپیہ کی پونجی سے شروع کیا تھا۔ لیکن اب اس کا سرمایہ کروڑوں میں ہے اور ہندوستان میں بلاسودی قرضہ دینے والے اداروں میں (دیوبند اور حیدرآباد) کے بعد اسے امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ موجودہ چار منزلہ عمارت عوامی قرضوں سے بنائی گئی ہے۔ ایک تجارتی کمپلکس کے ساتھ جس میں زمین دوز حصہ لیکر بالائی منزل تک نرسنگ ہوم، لڑکیوں کے سلائی کڑھائی کے مرکز، ملی مارکیٹ، کلاسیکی زبانوں عربی، فارسی و سنسکرت میں ریسرچ کرنے والے اسکالروں کے لیے کورس کی کتابوں پر مشتمل ایک عوامی لائبریری بھی ہوگی اور اب ملی لاج کی تعمیر سے شہر میں قیام کرنے والوں کو معمولی کرایہ پر رہائشی سہولتیں فراہم کرکے سوسائٹی نے ایک مشکل کام کو ہاتھوں میں لیا ہے۔

خراج تحسین

اسی افتتاحی تقریب میں ہندی کے معلم پنڈت شری کارام ترپاٹھی نے نہایت شستہ اردو میں بلاتکلف تقریر کرتے ہوئے کہا کہ دولت کا نظارہ تو اکثر جگہوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن اس کے صحیح مصرف کا احساس یہاں آکر اور ملی سوسائٹی کے کارناموں کو دیکھ کر ہوا ہے۔ جہاں "شریعت" کے اصولوں پر مبنی ایسے کاموں کا آغاز کیا گیا ہے۔ جس نے مادہ پرست دنیا کے سامنے ایک مثال پیش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے ساتھی ماسٹر نعیم اللہ اور ان کے مددگاروں نے جو شمع روشن کی ہے۔ اس سے دوسرے سماجی ادارے اور کارکن سبق حاصل کریں گے۔ سید ضرغام حیدر

سابق ایم۔ ایل۔ اے سید ضرغام حیدر ایڈووکیٹ (مرحوم) نے کہا کہ ملی امدادی سوسائٹی کی خدمات کا ذکر کرنا سورج کو چراغ دکھلانا ہے ادارے نے موجودہ معاشی نظام کے مقابلے اسلام کے اقتصادی فلسفہ زندگی پر عمل کرکے جس سے کامیابی سے ہمکنار کرکے ایک ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج حکومت کی طرف سے

بھی متعدد فلاحی اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں لیکن یہ اسکیمیں دیرپا اور مشکلات سے بھری ہوئی ہیں۔ برخلاف اس کے مذکورہ ادارے سے غریب عوام آسانی سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ اور پھر اسی ادارے نے ایک تجارتی کمپلیکس اور اب تلی لاج کی تعمیر کر کے ایک غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے۔

ممتاز سماجی شخصیت اور بھٹہ یونین کے صدر پنڈت لکشمی نرائن ترپاٹھی نے کہا کہ آج کا زمانہ پریشانیوں سے گھرا ہوا ہے۔ انسانیت دکھی ہے۔ ایسے عالم میں امدادی سوسائٹی نے عوام کی فلاح کے لیے اپنی خدمات کا عدیم المثال ریکارڈ پیش کیا ہے۔

مجاہد آزادی مولانا کلیم اللہ نوری نے کہا کہ ادارہ اپنے قیام سے ایک بڑی مشکلات سے دوچار رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے مشن کو جاری رکھ کر ایک ایسی قومی جائداد عوام کو دی ہے۔ جس پر بہرائچ کی تاریخ ہمیشہ فخر کرے گی۔

آخر میں صدر جلسہ مولانا سلامت اللہ بیگ (مرحوم) نے ایک مختصر اور جامع تقریر میں مہمان خصوصی ضلع مجسٹریٹ اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ عظیم عمارت خدمت خلق کی ایک عظیم یادگار ہے۔ صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ۔۔ ” ستائش کی تمنّا اور صلہ سے بے پرواہ ہو کر ۔

جگر داروں نے بنیاد جہاں جاوداں رکھ دی

(بحوالہ قومی آواز ۲۱ر اکتوبر ۱۹۸۳ء)

بہرائچ کا دنگا

نومبر ۸۳ء میں بہرائچ میں جو واقعہ رونما ہوا۔ اس کی حیثیت فرقہ وارانہ نہیں تھی بلکہ وہ سیدھا سیدھا پولیس ایکشن تھا۔ واقعہ صرف یہ تھا کہ محلہ برہمنی پورہ میں ایک مسجد کی زمین پر پولیس کی سرپرستی میں شیو لنگ رکھا کر دنگا بھڑکا یا گیا۔ اس سلسلے میں آر۔ ایس۔ ایس، وشو ہندو پریشد اور مقامی پولیس ادھیکاریوں۔ جن میں سی او سٹی۔ ایس او درگاہ اور پولیس چوکی بشیر گنج کے ایس او کی ملی بھگت سے مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کرنے کی سازش رچی گئی۔ شیو لنگ رکھے جانے کی اطلاع پہلے سے

مسلم لیڈروں نے ضلع مجسٹریٹ بہرائچ کو دے دی تھی اس اطلاع کے بعد مجسٹریٹ نے وہاں پولیس تعینات کر دی تھی۔ پولیس کی موجودگی میں وہاں شیولنگ رکھا گیا اور پوجا پاٹھ شروع ہو گیا۔ اس صورت حال سے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ ضلع مجسٹریٹ سے فوراً کچھ لوگ ملے انھوں نے ۲۴ گھنٹے کے اندر شیولنگ ہٹوا دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن جب شیولنگ نہیں ہٹوایا گیا۔ تو پھر مسلمانوں نے ضلع مجسٹریٹ سے مل کر ان کا وعدہ یاد دلایا۔ اور انھوں نے اسی طرح پھر دوبارہ وعدہ کیا۔ اس طرح تین دن گذر گئے اور شیولنگ نہیں ہٹا۔ ضلع مجسٹریٹ نے شیولنگ نہ ہٹنے کی اپنی مجبوری کا اظہار مسلم لیڈروں سے بھی کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ضلع مجسٹریٹ نے جب اس سلسلے میں راجدھانی سے رابطہ قائم کیا تو اتر پردیش سرکار کی ہوم منسٹری کے ایک بڑے ادھیکاری نے یہ مشورہ دیا کہ اب تو شیولنگ رکھا جا چکا ہے۔ اس لیے اب حالات کا مقابلہ کرو۔ اس صورت حال کے نتیجہ میں مسلمانوں نے ضلع مجسٹریٹ اور آنے والے منتری شری سنجے سنگھ کے سامنے احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا۔

اور صبح آٹھ بجے گھنٹہ گھر پارک میں بھاری تعداد میں مسلمان جمع ہونے شروع ہو گئے پولیس کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں پولیس نے آ کر لاٹھی چارج نہ صرف شروع کیا بلکہ گولیاں برسانی شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ افراد ہلاک ہوئے۔ جن میں دو شہری تھے۔ اور تین دیہاتی مزدور تھے۔ سرکار نے صرف دو افراد کے ہلاک ہونے کا صرف اعلان کیا۔ درجنوں لوگ زخمی ہوئے۔ تھوڑے دیر میں پولیس و انتظامیہ نے سرکار کے اشارے پر مار دھاڑ، لوٹ پاٹ و گرفتاریاں کرنے کا ننگا ناچ شروع کر دیا۔ اسّی سال کے بوڑھوں اور بارہ بارہ سال کے بچوں کو گرفتار کر کے ان کے ہاتھ پیر توڑ دیے گئے۔ ۳۲۶ لوگ گرفتار کیے گئے جن میں ۷۹ لوگوں پر کڑی دھارائیں لگائی گئیں۔ چھتیس[۳۶] چھتیس گھنٹوں تک ایک تنگ حوالات میں بھوکا پیاسا رکھا گیا۔

لہ نظام الدین خاں ایڈوکیٹ مرحوم و دیگر حضرات

حضرت مولانا اسعد مدنی دامت برکاتہم

بہرائچ دنگے کی خبر حضرت مولانا اسعد صاحب کو سوسائٹی کے صدر ماسٹر نعیم اللہ نے پہنچائی تو معلوم ہوا کہ مولانا ٹانڈہ فیض آباد گئے ہوئے ہیں کیونکہ وہاں بھی دنگا ہو گیا تھا۔ رابطہ قائم ہونے پر مولانا لکھنؤ آئے تو اتر پردیش سرکار مولانا کو بہرائچ جانے کی قطعی اجازت دینے کو تیار نہیں ہوئی۔ تو مولانا نے کہا کہ ہم کو بہرائچ ہر حال میں جانا ہے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے نتیجہ یہ ہوا کہ پھر سرکار نے اپنے ایک وزیر رام سنگھ کھنہ کو مولانا کے ساتھ بھیجنے پر مجبور ہو گئی۔ کرفیو کے دوران اگر اس وقت مولانا بہرائچ پہنچ نہ گئے ہوتے اور ضلع انتظامیہ کے ٹال مٹول کے باوجود دیہات کوتوالی کا معائنہ نہ کیا ہوتا تو ایک سو بتیس زخمی جو حوالات کے پیچھے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دئے گئے تھے وہ ۳۶ گھنٹے کے اندر ہوا اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے مر گئے ہوتے۔ مولانا کی آمد سے یہاں کی انتظامیہ پر کافی کچھ اثر ہوا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں پر مزید ظلم و زیادتی نہیں ہو سکی۔

کرفیو لگنے کے بعد اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر جن دو شخصیتوں نے ماسٹر نعیم اللہ کے ساتھ مل کر شہر کے حالات کو بنانے و سنوارنے میں جد و جہد کی ان میں ماسٹر عبدالقدوس و محمد مقبول خاں ایڈووکیٹ سر فہرست تھے۔

مذہب تبدیلی کا واقعہ اور ملی امدادی سوسائٹی

اپریل ۸۵ء میں نیپال سرحد سے ۱۶ کلومیٹر دور ایک علاقہ کے تین سونٹ ذات کے لوگوں نے اجتماعی طور سے اسلام مذہب قبول کر لیا۔ تو فرقہ پرست و برہمن وادی تنظیموں نے وہی کچھ واویلا مچایا جو ۸۱ء میں تامل ناڈو کے میناکشی پورم کے ہریجنوں کے اجتماعی قبول اسلام کے سلسلے میں مچایا تھا۔ اس سلسلے میں بہرائچ کی ملی امدادی سوسائٹی کو اور خصوصاً اس کے صدر ماسٹر نعیم اللہ کو گھسیٹنے کی کوشش کی گئی۔ ہندی رسالہ مایا نے ماسٹر صاحب کی فوٹو شائع کر کے بہت کچھ لکھ ڈالا۔ دوسری طرف دینک جاگرن نے سوسائٹی کے دفتر کا فوٹو شائع کر کے پوری طور سے سوسائٹی کو ملوث کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی مدرسہ

نور العلوم و وقف درگاہ شریف کو بھی اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی۔

دیکھئے جاگرن کا اقتباس:

"شہر کے بیچ بیچ گھنٹہ گھر کے پاس ملّی امدادی سوسائٹی کا کاریالیہ ہے۔ قریب آٹھ دس ورش پور و مسلمانوں کو آرتھک سہایتا پردان کرنے کے اُدیشیہ سے اس سوسائٹی کا گٹھن کیا گیا تھا۔ گٹھن کے سمے سے ہی ایک پرائمری اسکول کے ادھیاپک شری نعیم اللہ اس کے سروے سروا تتھا سنچالک ہیں۔ استھانیہ راج نیتاؤں تتھا پولیس کے کچھ ادھیکاریوں کے انوسار سوسائٹی کے پاس کروڑوں کی سمپتی ہے۔ تتھ یہ بینکر کا کام کرتی ہے اس کے علاوہ گھنٹہ گھر میں ہی سوسائٹی کا ایک عالی شان بھون ہے۔ جن میں انیک دوکانیں و لاج چل رہے ہیں بھوت پورو ودھائک جٹا شنکر نے بتایا کہ کروڑوں کی سمپتی ایکتر ہو جانے کے باوجود ابھی تک اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ یہ دھن کہاں سے آتا ہے تتھا کس کس مد میں خرچ ہوتا ہے۔ ضلع ادھیکاری ڈاکٹر ادم پرکاش کے پاس بھی میرے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا کہ سوسائٹی کے آئے۔ بیائے کی رپورٹ کیا کہتی ہے تتھا بغیر ریزرو بینک کی انومتی کے سوسائٹی بینکنگ کا کام کیسے کر رہی ہے شری جٹا شنکر کا آروپ ہے کہ ملی امدادی سوسائٹی کے خلاف آئے کر کا بھی ایک معاملہ چل رہا ہے۔ کنتو جس ادھیکاری نے یہ معاملہ اٹھایا تھا اس کا استھانانتر کرا دیا گیا۔ شری جٹا شنکر سنگھ نے اسپشٹ آروپ لگایا کہ دھرمانتر میں ملّی امدادی سوسائٹی کے ذریعہ ہی پیسہ خرچ کیا جاتا ہے۔"

(بحوالہ "دینک جاگرن" ۱۱ اپریل ۱۹۸۵ء)

اس طرح مذہب تبدیلی کے اس واقعہ میں سوسائٹی کو گھسیٹنے سے سوسائٹی کو ملکی پیمانے اور

زیادہ شہرت حاصل ہو گئی۔

سوسائٹی میں پیالے میاں کی اٹھک بیٹھک

ماسٹر صاحب کے بڑے صاحبزادے علیم اللہ عرف پیالے کی سوسائٹی میں اٹھک بیٹھک کا سلسلہ غالباً ستمبر ۱۹۸۵ء سے شروع ہوا۔ اس اٹھک بیٹھک پر ابتدا میں کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ لیکن جب پیالے میاں کا سوسائٹی کے معاملہ میں کچھ بے جا عمل دخل بڑھنے لگا۔ تو لوگوں نے ناک بھوئیں چڑھانی شروع کردیں۔ اس صورت حال کو دیکھنے کے بعد میں نے ماسٹر صاحب کی توجہ اس جانب مبذول کرائی اور ان سے کہا کہ آپ اس کو یہاں کیوں بٹھالتے ہیں؟ میرے اس کہنے پر ماسٹر صاحب نے جواب دیا کہ۔ اس کی سوسائٹی بگڑ رہی تھی۔ میں نے یہاں اس خیال سے اس کو بٹھالنا شروع کر دیا کہ یہاں بیٹھے گا تو لوگوں کی بات چیت و صحبت سے اس کے اندر بدلاؤ آجائے گا۔ نہیں تو یہ بگاڑ کی راہ پر چلا جائے گا۔ بات معقول و جائز تھی۔ ایک باپ کو اپنے بچے سے اتنی ہمدردی تو ہونی چاہیے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت پیالے کی سوسائٹی میں اٹھک بیٹھک میں ماسٹر صاحب کی اس کے علاوہ اور کسی قسم کی کوئی غرض وغایت شامل نہیں تھی اور نہ ان کے خواب وخیال میں یہ بات آئی ہو گی کہ پیالے میاں کو سوسائٹی سے وابستہ کروں گا۔ لیکن وقت اور حالات نے دھیرے دھیرے چیونٹی کی چال کی طرح ہماری سوچ و فکر کو جب بدلنا شروع کر دیا۔ تو یہ بدلاؤ صرف فرد تک محدود نہ رہ کر افراد میں بھی دھیرے دھیرے پھیلتا چلا گیا۔ بدگمانیاں بڑھنے لگیں۔ شکوک و شبہات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اس طرح جہاں جوڑ تھا وہاں توڑ کی شکلیں پیدا ہونے لگیں۔ جہاں موافقت تھی وہاں دلوں میں مخالفت کے بیج پڑنے لگے اور یہ سلسلہ بجائے کم ہونے کے دھیرے دھیرے بڑھتا ہی رہا۔ یہ وہ بنیادی غلطی تھی جس سے ماسٹر صاحب کی پوزیشن کسی نہ کسی معنوں میں متاثر ہوتی رہی۔

مخالفت و موافقت اور خریداری آراضی تلی فارم

۱۳ ستمبر ۱۹۸۶ء کو آراضی "تلی فارم" کی خریداری عمل میں آئی۔ اس آراضی کی خریداری کے سب سے زیادہ مخالف ماسٹر صاحب کے سگے بھائی پرنسپل حمید اللہ تھے۔ انھوں نے

کہا تھا کہ اب یہ آراضی جھگڑے و انتشار کی جڑ ہوگی۔ لیکن اس وقت کے حالات میں ان کی اس مخالفت پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ الٹے اس مخالفت کی ہنسی اُڑائی گئی۔ ان ہنسی اڑانے والوں میں ہم بھی شریک تھے۔ کیونکہ حمید اللہ صاحب اس آراضی کی خریداری کی مخالفت کے پیچھے جھگڑے و انتشار کی جڑ کا ذکر تو ضرور کرتے تھے۔ لیکن وہ اس بنیاد کو سمجھانے سے قاصر تھے کہ جھگڑا کیسے و کیسے ہوگا؟ بالفرض اگر وہ سمجھا بھی لے جاتے تب بھی شاید اس وقت ان کی مخالفت پر کوئی بس بنانے کو تیار نہ ہوتا۔ لیکن ان کا اندیشہ سچ ثابت ہوا۔ میں اس وضاحت میں جانا نہیں چاہتا کہ اس آراضی سے سوسائٹی کو کیا نقصان پہنچا یا کیا فائدہ ہوا۔ اور نہ اس پر کوئی تبصرہ کرنا چاہتا ہوں لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اس آراضی کی خریداری کے بعد سے ہم بہت جلد اپنے مقصد سے ہٹ کر بھٹکاؤ کی راہ پر چل پڑے۔ ہم نے اپنے نجی مفاد آراضی ملّی فارم سے ۱۹۸۷ء سے عمل کی حد تک نہ صحیح سوچ و فکر کی حد تک ضرور وابستہ کر لئے تھے۔ جس نے بعد کو عمل کا روپ لے لیا۔

شاہ بانو کیس و عارف محمد خاں کے تیور غنڈوں کے ذریعہ مسلم لیڈروں کی پٹائی و جیل میں لاٹھی چارج

شاہ بانو کے معاملہ میں سپریم کورٹ کا فیصلہ جان بوجھ کر پرسنل لا میں مداخلت پر مبنی تھا۔ اس فیصلے کے بعد عارف محمد خاں نے جو مرکز میں وزیر تھے اور بہرائچ سے پارلیمنٹ کے نمائندے تھے۔ انھوں نے پرسنل لا کی مخالفت میں بیان دے کر جو منافقانہ کردار ادا کیا۔ اس سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں بد دلی پیدا ہو گئی۔ جگہ جگہ احتجاج و جلسے جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن عارف محمد خاں کے تیور میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اسی اثناء میں انھوں نے اپنے حلقہ انتخاب بہرائچ آنے کا ارادہ کیا۔ تو یہاں کے مسلمانوں نے عارف کو بہرائچ میں داخل نہ ہونے دینے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کی خبر عارف خاں کو جب لگی تو انھیں اپنے پروگرام کو ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے بعد عارف نے کئی بار اپنے آنے کا پروگرام طے کیا۔ لیکن ہر بار انھیں یہاں کے مسلمانوں کے تیور دیکھ کر اپنے پروگرام کو ملتوی کرنا پڑا۔ بالآخر وہ گھڑی آ گئی جب عارف محمد خاں نے اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ مع ہتھیاروں ڈنڈوں سے لیس اپنے سیکڑوں غنڈوں کے ساتھ

بہرائچ نہ صرف آنے کا اچانک پروگرام بنالیا۔ بلکہ ضلع کی انتظامیہ کو جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کر روپیہ دے کر اپنے سے ملالیا۔ اور جب ضلع انتظامیہ نے پوری طور سے ہر جھنڈی دے دی۔ تو عارف محمد خاں مع اپنے غنڈوں کے ساتھ بہرائچ کے لیے چل پڑے اور پھر بہرائچ سے تین کلومیٹر پر ہی پولیس کی پشت پناہی میں عارف کے غنڈوں نے نہتے مسلمانوں پر ڈنڈے وچھڑیں برسانی شروع کر دیں۔ نتیجہ ہر جگہ خون ہی خون دکھائی دینے لگا۔ پولیس نے عارف کے غنڈوں کو گرفتار کرنے کے بجائے۔ ان تمام زخمی اور چوٹ کھائے لوگوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اور پھر ضلع جیل میں بھی عارف ہی کے اشارے پر کئی مرحلوں میں لاٹھی چارج کروایا گیا۔ اس طرح جیل میں بھی کئی ایک لوگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں بقول ماسٹر حشمت اللہؒ کہ عارف کو داخل نہ ہونے دینے کے لئے مسلمانوں کو تین جتھوں (ٹولیوں) میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پہلے جتھے کی قیادت ماسٹر محمد نعیم اللہ کے ذمہ تھی۔ دوسرے کی قیادت محمد مقبول خاں ایڈوکیٹ و ڈاکٹر فاروق وغیرہ کے ذمہ تھی۔ اور تیسرے کی قیادت مولانا کلیم اللہ نوری کر رہے تھے۔ عارف کا قافلہ جیسے ہی تکونے موڑ پر آکر رکا۔ غنڈے لاٹھی و ڈنڈے چھڑیں لے کر باہر نکلنے شروع ہو گئے۔ اور نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے کافی دیر تک ڈنڈوں سے لیس غنڈوں کا مسلمانوں نے

لہ بقول ماسٹر حشمت اللہ کہ عارف کے غنڈوں نے جب چھڑیں اور ڈنڈے برسانے شروع کر دئے تو لوگ بھاگنے لگے۔ ماسٹر صاحب کے ساتھ صرف میں ہی موجود تھا۔ غنڈے ماسٹر صاحب پر لاٹھی و چھڑ سے پل پڑے۔ ان کے سر پر ڈنڈے وچھڑیں برسانے لگے مع اپنے ہاتھوں سے روکتا رہا کہ ڈنڈا ان کے سر پر نہ پڑے۔ بالآخر جب ہماری ہمت ہار گئی اور چوٹ برداشت نہیں ہوئی تب ہی ماسٹر صاحب کے سر پر ڈنڈے ٹرسکے جس کی وجہ سے ان کا سر پھٹ گیا۔ کپڑے لہولہان ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ میں اس منظر کو آج بھی نہیں بھلا پا رہا ہوں۔ لیکن جب میں نے سنا کہ" ماسٹر صاحب نے عارف محمد خاں سے سوسائٹی کے لیے روپیہ حاصل کر لیا ہے تو مجھے یقین نہیں ہوا۔ لیکن جب کئی لوگوں کی تصدیقی شہادت مل گئی۔ تو مجھے بے حد افسوس ہوا۔ اس اقدام سے ماسٹر صاحب کو بذات خود راحت مل گئی ہو لیکن عوام میں ان کی پوزیشن اور زیادہ خراب ہوئی۔

ٹ ہو گیا۔ بالآخر مجبور ہو کر مسلمان بھاگنے لگے۔ ماسٹر نعیم اللہ سب سے زیادہ چوٹ کھائے ان کا سر پھٹ گیا۔ سارے کپڑے نیچے سے اوپر تک خون سے شرابور ہو گئے۔ اس جتھے میں شامل ماسٹر عبدالقدوس بھی کافی چوٹ کھائے۔ اس طرح عارف کا قافلہ آگے بڑھا اور جہاں جو کوئی ملتا گیا اور جس نے بھی مزاحمت کی اس کو پولیس کی پشت پناہی میں جم کر پیٹا گیا۔ یوں تو چوٹ کھائے اور زخم کھائے لوگوں کی تعداد کافی تھی۔ لیکن جن اہم لوگوں کو چوٹیں آئیں۔ ان میں ماسٹر عبدالقدوس، مولانا کلیم اللہ نوری۔ ماسٹر محمد نعیم اللہ۔ محمد مقبول خان ایڈوکیٹ شامل تھے۔ اور کچھ چوٹ ڈاکٹر فاروق بھی کھائے تھے۔

ٹھیکہ کھاد رام گنگا فرٹیلائزر

۱۹۸۶ء میں ہی آراضی ملی فارم خریداری کے بعد رام گنگا فرٹیلائزر کا ٹھیکہ لیا گیا۔ اس ٹھیکے کے ساتھ لوگوں کے اپنے مفاد وابستہ ہوئے۔ مفاد کی وابستگی سے فساد کی ابتدا ہوئی۔ اور یہی بگاڑ کی بنیاد بنا۔ جہاں نیک نیتی، اخلاص و بے غرضی کارفرما تھی وہاں اغراض پسندی و مفاد پرستی کے جراثیم دل و دماغ میں پیدا ہونے شروع ہو گئے اور یہیں سے شروع ہو گیا زوال کا لامتناہی سلسلہ۔ سوسائٹی کا نام اور کام تو ضرور بڑھتا رہا لیکن روح نکلتی چلی گئی۔ نیک نیتی و اخلاص کا گراف دھیرے دھیرے نیچے گرتا رہا۔ تو دوسرے اور قسم کے اغراض کا گراف اوپر چڑھتا رہا۔

علیم نیوز ایجنسی

۷ مئی ۱۹۸۷ء کو علیم کے نام سے نیوز ایجنسی لی گئی۔ بعد کو لوگوں میں جب چہ میگوئیاں شروع ہوئیں تو "ملی نیوز ایجنسی میں تبدیلی کی گئی۔ اس ایجنسی سے کس کو کیا کچھ ملا اور کس نے کیا کچھ کھویا؟ .... اور اس کے لینے کے پیچھے کیا غرض و غایت کارفرما تھی؟ ...... اس پر ہم کوئی رائے زنی و تبصرہ تو نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ یہ نیوز ایجنسی بھی اسی بیماری کا ایک حصہ تھی جو مخالفت و موافقت کا ذریعہ بنی۔

یہی وہ تین بنیادی مدّے تھے (ملی فارم، رام گنگا فرٹیلائزر نیوز ایجنسی) جو ۸۸ء کے اختلافات و انتشار کا سبب بنے جن کو ہمارے دوست ماسٹر عبدالقدوس نے مخلص و نیک نیت

ہو کر نہیں بلکہ خود کو ذاتی تکلیف پہنچ جانے کی بنیاد پر بڑی جرأت و بے باکی سے حصہ دار ٹھایا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ اس بے باکی و جرأت کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکے اور میدان سے نہ صرف خود بلکہ ان کے ہمنواؤں تک نے راہ فرار اختیار کر لی۔

ہومیو شفا خانوں کا قیام

سوسائٹی کے زیر انتظام شہر میں کئی جگہ ہومیو شفا خانہ قائم ہوئے اور دو چار سال چلنے کے بعد بند ہو گئے۔ مسجد عالم شہید کی دوکان میں قائم شفا خانہ غالباً ۸۷ء میں شروع ہوا۔ جو ۱۹۹۵ء میں بالکل بند ہو گیا۔

شاخوں کے قیام کا آغاز

شاخوں کے قیام کا آغاز ۱۹۸۷ء سے شروع ہوا۔ جبکہ ہماری سوچ و فکروں کی تبدیلی کے نتیجہ میں اپنوں بین ناراضگی و خفگی کے آثار دھیرے دھیرے ۸۶ء سے رونما ہونے لگے تھے اور کچھ لوگوں کی بے چینیاں بڑھنے لگی تھیں کیونکہ جن بنیادوں پر ادارے کی بقا و سلامتی کا دار و مدار تھا اخلاص۔ للّٰہیت۔ نیک نیتی، خدمت خلق، دردمندی و دل سوزی کا جذبہ وہ دھیرے دھیرے شکستہ و تاراج ہوتا جا رہا تھا۔ ہماری سوچ و فکروں پر جہاں اخلاص و للّٰہیت تھی۔ وہیں ہمارے دل کے گوشوں میں خود نمائی و خود پسندی اور دوسرے اور قسم کے اغراض کی جھلک بھی نمایاں ہو چلی تھی۔ اس طرح ہم بظاہر ترقی کی آڑ میں زوال کی طرف بھی گامزن تھے۔ انہی حالات میں سوسائٹی کی پہلی شاخ ۸ر مارچ ۸۷ء کو قیصر گنج میں قائم کی گئی۔ اس کے بعد ۸۸ء میں تین مزید اور شاخیں ایٹیا تھوک ضلع گونڈہ، فخر پور و جرول بہرائچ قائم کی گئیں۔ قیصر گنج سوسائٹی کے قیام کے بعد سے ہی اختلافات و انتشار شروع ہو گیا اور یہ اختلافات و انتشار دھیرے دھیرے اس حد تک بڑھا کر سوسائٹی اپنا وجود کھونے کے قریب تک پہنچ گئی۔ حالانکہ ان اختلافات کو ختم کرنے کی ہم نے بھرپور کوشش کی۔ لیکن جہاں مفاہمت کے بجائے ضد ہٹ دھرمی حسد و جلن۔ ذاتی مخاصمت۔ بغض و کینہ، غرور انا

ؔ اس سوسائٹی نے غالباً ۱۹۹۳ء میں ہی سوسائٹی سے بغاوت کر کے اپنی الگ پہچان بنالی

کا جذبہ غالب آجائے تو مسئلہ کا حل نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور یہ صورت حال دونوں طرف تھی۔ کوئی جھکنے اور ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بمشکل ۳؍ جولائی ۸۸ء کو میٹنگ طلب کرائی گئی تو مخالف گروپ نے میٹنگ کو غیر آئینی کہہ کر میٹنگ کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس بائیکاٹ کرنے میں منافقانہ رول ادا کرنے والوں کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔ اوپر سے مصالحت کا ڈرامہ اور اندر اندر اس سے گریز نتیجہ میں صدر ماسٹر نعیم اللہ کو کھلی فتح حاصل ہو گئی۔ اور میٹنگ میں اتفاق رائے سے کچھ لوگوں کو سوسائٹی سے نکال بھی دیا گیا۔ اس طرح ماسٹر صاحب کے راستہ کے وہ تمام کانٹے دور ہو گئے جو ان کے راستے میں سد راہ بن کر انھیں سنبھلنے اور سوچنے کا موقع دے سکتے تھے۔ اور یہ سوسائٹی کے حق میں کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

باہمی کشمکش پر قومی آواز کا رول

۱۲؍ جولائی ۸۸ء کو نامہ نگار قومی آواز کی رپورٹنگ سے بحران کی صورت حال کا اندازہ کریں جو من عن نقل کی جا رہی ہے۔

"بہرائچ۔ ۱۱؍ جولائی۔ یہاں اقلیتی فرقہ اور حاجت مند افراد کو بلا سودی قرضہ فراہم کرنے والی ایک بڑی اور باوقار ملی امدادی سوسائٹی میں باہمی کشمکش نے ایک نیا موڑ لے لیا ہے۔ سوسائٹی کے سرپرست مولانا ذکر اللہ اور اس کے خزانچی حاجی منظور احمد نکرانی نے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ دوسری طرف سوسائٹی کی برسر اقتدار جماعت نے ایک جلسہ میں سوسائٹی کے نائب صدر مسٹر سردار علی سکریٹری وصی الدین، جوائنٹ سکریٹری مسٹر عبد القدوس اور مجلس منتظمہ کے پانچ ممبروں کو خارج کر دیا ہے۔ اس طرح گذشتہ دنوں سوسائٹی کا بحران ٹل جانے کی جن توقعات کا اظہار کیا جا رہا تھا وہ اب امید موہوم میں بدلتا جا رہا ہے۔ جس شہر کا سنجیدہ باشعور ملی درد رکھنے والا اور حاجت مند طبقہ نہایت فکر مند ہو گیا ہے اس کے ساتھ ہی عوام میں ایسی بدگمانیاں پھیلائی جا رہی ہیں جس کی وجہ سے سوسائٹی کے فنڈ کھاتہ دار اپنا پیسہ برابر نکال رہے ہیں ایک اندازے کے مطابق روزانہ روپیہ نکالنے والوں کا اوسط دو دو لاکھ تک پہنچ رہا ہے

جیساکہ عام دنوں میں یہی اوسط تناسب ساٹھ ستر ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں تھا۔

اس لیے اب عوام کی نگاہیں ثالثی بورڈ کے اراکین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید اسعد مدنی ایم پی اور مولانا کلیم اللہ نوری پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ مداخلت کر کے معاملات کو طول پکڑنے سے روکیں۔

ثالثی بورڈ

ہمارے نمائندے نے ثالثی بورڈ کے ایک رکن مولانا کلیم اللہ سے رابطہ قائم کر کے اس مسئلہ پر ان کی رائے معلوم کی۔ انھوں نے کہا کہ فریقین سے ہماری جو گفتگو ہوئی ہے اس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ ایک فریق کسی طرح افہام وتفہیم پر آمادہ نہیں ہے جو ہم سب کے لیے باعث تشویش ہے۔ بہر حال ہماری کوششیں جاری ہیں انشاء اللہ ہم لوگ ایک فعال اور قابل قدر نگاہوں سے دیکھی جانے والی مذکورہ سوسائٹی کو منتشر نہ ہونے دیں گے۔ اور میرا اندازہ ہے فریقین حالات کا احساس کر کے ایسی راہ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس سے سوسائٹی کی عظمت اور اس کا وقار برقرار رہے۔

منحرف گروہ کے بیس ممبروں نے جن میں سے پانچ نے اپنی رائے بدل دی، ایک یادداشت کے ذریعہ سوسائٹی کے صدر مسٹر نعیم اللہ پر سوسائٹی کو من مانے ڈھنگ سے چلانے، آزادطریقہ اختیار کرنے اور اس کے فنڈ کو خرد برد کرنے کے سنگین الزامات لگا کر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ موجودہ صدر سوسائٹی کے بائی لاز کے مطابق بدعنوانی کے الزامات کے پیش نظر اپنی صدارت سے محروم ہو چکے ہیں اس سے ان کو سوسائٹی کو چلانے یا اس کے کسی جلسے کی صدارت کرنے کا حق باقی نہیں رہ گیا ہے۔ یہ یادداشت ثالثی بورڈ کے اراکین کے پاس بھیجی گئی ہے۔

دوسرا فریق

سوسائٹی کے صدر مسٹر نعیم اللہ نے "قومی آواز" کو بتایا کہ میں امداد کا

سوسائٹی کے ۴۲ مستقل ممبروں میں سے تیس کا مجھے اعتماد حاصل ہے کیوں کہ ان ممبروں نے اپنے ایک جلسہ میں جو میری صدارت میں ہوا تھا، منحرف گروہ کے ممبروں (جن میں ایک نائب صدر، ایک سکریٹری، ایک جوائنٹ سکریٹری اور پانچ دیگر ممبر شامل ہیں) کو سوسائٹی سے خارج کر دیا ہے۔ یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا کہ ان میں سے بعض عہدہ دار اور ممبر چندہ نہ دینے کے باعث نااہل ہو چکے تھے اور بعض پر سوسائٹی کے خلاف تخریبی سرگرمیوں کا الزام ہے۔

انھوں نے ایک سوال کے جواب میں مزید کہا کہ اس بحران سے یقیناً سوسائٹی کے بہی خواہوں اور ضرورت مندوں میں بے چینی پیدا ہے۔ کیوں کہ روزانہ سوسائٹی کے کھاتے میں تقریباً اسّی ہزار روپے جمع ہوتے تھے اور تقریباً ساٹھ ہزار روپیہ ضرورت مند لے جاتے تھے اب اس حالت میں جمع کرنے والے کم ہیں اور روپیہ نکالنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

مسٹر نعیم اللہ نے مزید کہا کہ کسی بھی جمہوری ادارے کے ممبروں کی اکثریت اگر محسوس کرے کہ اس کا صدر بدعنوانی کا مرتکب ہے اور اس سے سوسائٹی کا ڈھانچہ منتشر ہو رہا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے خلاف عدم اعتماد لایا جائے۔ جبکہ یہ عمل نہ کر کے اقتدار کی ایک جنگ چھڑ گئی ہے۔ اسی لیے میں نے اس بحران پر قابو پانے کے لیے سوسائٹی کے مستقل ممبروں کا جلسہ بلایا۔ ایجنڈا گشت کرایا اور منحرف ممبروں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ انھیں ہمارا ایجنڈا ملا بھی اس کے باوجود ممبروں نے جنھوں نے صدر کے خلاف یادداشت دی ہے۔ مذکورہ جلسہ کا بائیکاٹ کیا۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی قابل غور ہے کہ مذکورہ بتیس ممبروں سے ۵ ممبر ہمارے طلب کردہ جلسہ میں موجود تھے اور انھوں نے کہا کہ ان لوگوں نے محض غلط فہمی اور غلط پروپگنڈے کا شکار ہو کر دستخط کر دئے تھے اور ان کو موجودہ صدر پر اعتماد ہے؟

منحرف گروہ کے ایک ترجمان اور سوسائٹی کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر عبدالقدوس

نے ہمارے نمائندے کو ایک ملاقات میں بتایا کہ ان کی موجودگی کا مقصد بنیر کو نقصان پہنچانا نہیں ہے بلکہ سوسائٹی کے صدر کو اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھانے سے روکنا مقصود ہے مثلاً سوسائٹی کے صدر کو پانچ سو روپیہ ہنگامی ضرورت کے تحت خرچ کرنے کا اختیار دستور نے دیا ہے جبکہ وہ پانچ ہزار تک نکال لیتے ہیں۔ یہ پوچھے جانے پر کہ یہ عمل تو تقریباً سولہ سال سے جاری ہے اب کون سی نئی بات پیدا ہوگئی مسٹر عبدالقدوس نے کہا کہ اب حالات سنگین ہو گئے ہیں اس لئے اس کا محاسبہ ضروری ہے

شرکت کیوں نہ کی

اس سوال کے جواب میں کہ انھوں نے اس جلسہ میں کیوں شرکت نہیں کی جسے سوسائٹی کے موجودہ صدر نے بلایا تھا۔ جوائنٹ سکریٹری نے کہا کہ سوسائٹی بائی لاز کے تحت جب صدر ایک متنازعہ شخصیت بن جائے تو وہ جلسہ کی صدارت نہیں کر سکتا ہم نے اسی قانونی جواز کے پیش نظر شرکت سے گریز کیا کیونکہ صدر جلسہ مسٹر نعیم اللہ تھے۔

اس سوال پر کہ سوسائٹی کے ممبروں کی اس باہمی کشمکش کے نتیجہ میں سوسائٹی ایک بحران سے گزر رہی ہے۔ عوام کا اعتماد متزلزل ہو رہا ہے جس سے روپیہ نکالنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور بلا سودی بینک کا کاروبار ٹھپ ہو جانے کا خطرہ منڈلا رہا ہے اور یہ بات پریشان حال اور کمزور طبقہ کے لیے جنھیں اس سوسائٹی کے ذریعے بلا سودی قرضے کی آسانیاں حاصل ہیں بڑی بڑی ہی تشویش ناک اور تکلیف دہ ہیں۔ کیا اس طرح پھر وہ مہاجنی کے چنگل کا شکار نہ ہو جائیں گے۔ جبکہ سوسائٹی کے موجودہ صدر بلا سودی بینک کے بینک کا لین دین اور کاروبار بند ہو جانے کے بعد بھی اس کی عالیشان عمارت اور اس کے معاملات پر بدستور کنٹرول برقرار رکھیں گے۔ پھر اس مخالفت سے براہ راست صدر کہاں تک متاثر ہوں گے۔ اس کے بارے میں

آپ کے ہمدردوں کی کیا رائے ہے۔ مسٹر عبدالقدوس نے کہا کہ اوّل تو ہم لوگ نہ تو تنظیم کے اور نہ ہی کسی شخصیت کے ذاتی مخالف ہیں بلکہ ہمارا مقصد سوسائٹی کو بدعنوانیوں کے الزام سے دور اور ایک ایسا ماحول برقرار رکھنا ہے جس سے کسی کو بدگمانی کا موقع نہ ملے۔ اس کے علاوہ ہماری نگاہ ان مضمرات پر بھی ہے جس کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن یہ کام ہم آئینی طریقہ سے انجام دے رہے ہیں اسی لیے ہم نے مفاد عامہ اور سوسائٹی کی وقار اور عظمت کو پیش نظر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے سے ابھی تک گریز کیا ہے۔

خازن

سوسائٹی کے خزانچی الحاج منظور احمد مکرانی نے بھی ہمارے نمائندے کو اپنے استعفا کی فوٹو اسٹیٹ کاپی حوالے کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاس ایک لاکھ ۲۰ ہزار نکالنے کے لئے چیک بک مری دستخط کے لئے آئی تھی اور میں دستخط سے اس لیے منکر تھا کہ میرے خیال کے بموجب اگر میں صدر کے ساتھ اس چیک بک پر دستخط کرتا تو اس طرح گویا مجھے بھی صدر پر اعتماد ہے جب کہ میں بھی منحرف گروہ کے خیالات سے پوری طرح متفق ہوں لیکن اب میں نے استعفا دے دیا ساتھ ہی چیک بک پر دستخط کر دیئے اور بینک کو بھی اطلاع دے دی تاکہ سوسائٹی سے روپیہ نکالنے والے ضرورت مند جنھیں میری وجہ سے پریشانی نہ ہو۔ کیوں کہ روپیہ نکالنے کے لیے دو دستخط ضروری تھے۔

یاد رہے کہ ملی امدادی سوسائٹی ۱۹۷۲ء میں صرف چھ روپیہ کی پونجی سے دیوبند کے مسلم فنڈ کے طرز پر قائم کی تھی اب اس کا سرمایہ ساٹھ لاکھ ہے اور حیدرآباد دکن کی بلاسودی قرضہ کی سوسائٹی کے بعد حاجت مند افراد کو قرضہ دینے میں ہندوستان میں دوسری حیثیت رکھتی ہے یہاں سالانہ قرضہ دینے کی اوسط تقریباً ۹۴ لاکھ ہے اس کے علاوہ مسلم فنڈ دیوبند اور حیدرآباد دکن کی سوسائٹی کے ساتھ ملی امدادی سوسائٹی بھی نہ صرف ہندوستان بلکہ

بیرونِ ہند میں بھی بڑی عزت اور مستحسن نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

بحران کا حقیقت پسندانہ تجزیہ

اس مضمون سے ہمارے رول کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جسے سیاست جدید کانپور اور ہفتہ وار قومی ترجمان لکھنؤ نے ۲۶ اگست ۱۹۸۸ء کو شائع کیا تھا اور جس اندیشے کا اظہار ہم نے مضمون میں کیا تھا کیا آج اس کے صحیح ثابت ہونے میں کچھ تردد ہے؟

"بہرائچ میں ملی امدادی سوسائٹی کے ذریعہ جو ایک خاموش اور تعمیری کام انجام دیا جا رہا تھا۔ آج وہ سوسائٹی جس بحران کا شکار ہے۔ وہ یقیناً تشویشناک ہے اور یہ بحران جہاں ذاتی مخاصمت اور اغراض پسندی پر مبنی ہے وہیں صدر سوسائٹی، ماسٹر نعیم اللہ کی سخت مزاجی اور بعض معاملات میں ان کی جدت پسندی جسے ڈکٹیٹرانہ طرزِ عمل کا نام دیا جاتا ہے کا بھی بہت بڑا دخل ہے اور یہ ڈکٹیٹرانہ طرزِ عمل اراکین سوسائٹی کی سرد مہری، اندھی حمایت و عدم دلچسپی کا نتیجہ ہے۔

حقیقت میں اس بحران کے روحِ رواں سوسائٹی کے جوائنٹ سکریٹری عبد القدوس اور صدر سوسائٹی ماسٹر نعیم اللہ کے آپسی و ذاتی اختلافات تھے اور یہ اختلافات دس ماہ سے چل رہے تھے مجھے یہ بات اس لئے کہنا پڑ رہی ہے کہ میں ۱۶ اگست ۱۹۸۷ء کو ایک شادی کے سلسلے میں بہرائچ گیا تھا تبھی ہمارے دوست ماسٹر عبد القدوس نے چند مسائل ہمارے گوش گزار کئے تھے ساتھ ہی ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ماسٹر صاحب کے قریب چند خوشامد پسند ایسے پہنچ گئے ہیں جو انھیں راستے سے بھٹکا رہے ہیں اور ماسٹر صاحب ان پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں (دھیان رہے مسٹر عبد القدوس پہلے ماسٹر نعیم اللہ کے بڑے معتمد خاص تھے ان کے دست راست سمجھے جاتے تھے۔ جا اور بے جا ہر بات میں نعیم اللہ کے حمایتی تھے) میں نے ان کی باتیں سنیں اور وعدہ کیا کہ میں ماسٹر نعیم اللہ صاحب کو خط لکھوں گا میں نے حسب وعدہ صدر صاحب کو خط لکھا خط ملنے کے ایک ہفتہ کے اندر صدر صاحب مجلس عاملہ کے ایک رکن حاجی امین بیگ کے

ل اشارہ غلام مصطفیٰ وارثی عرف اچھن

ہمراہ لکھنؤ تشریف لائے اور اس مسئلہ پر تقریباً ایک گھنٹہ تفصیلی گفتگو ہوئی۔ میں نے اس گفتگو کا حاصل مسٹر عبدالقدوس کے گوش گذار کیا تو انھوں نے کہا کہ ان کا جواب صحیح نہیں ہے انھوں نے آپ کو بھی گمراہ کیا ہے میں نے کہا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے اس کا اندازہ تو اسی وقت ہوسکے گا جب آپ دونوں ایک میز پر بیٹھیں۔ اس ضمن میں ہم نے دونوں حضرات کو ایک میز پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ ماسٹر عبدالقدوس صاحب بات کرنے پر کسی طرح تیار نہیں ہوئے اور یہ کہہ کر کتراتے رہے کہ لڑائی ہو جائے گی۔ میں نے ان کے سامنے یہ تحریری فارمولا رکھا کہ آپ جن مسائل کی صفائی چاہتے ہیں وہ ہمیں نوٹ کر کے دے دیں اور اپنی سہ رکنی یا دو رکنی کمیٹی بنائیں اور کچھ ذمہ دار حضرات کے سامنے ایک میز پر بیٹھ جائیں تمام مسائل پر بات میں کروں گا۔ اگر کہیں کوئی کمی رہ جائے تو اس میں آپ ہماری مدد کر دیں۔ یہ خود بحث میں حصہ لیں۔ مگر وہ اس پر بھی کسی طرح تیار نہیں ہوئے ان کا کہنا تھا کہ وہ میٹنگ بلاتے ہم میٹنگ میں یہ بات اٹھائیں گے مگر وہ میٹنگ بلانا نہیں چاہتے میں نے کہا کہ اگر صدر میٹنگ نہیں بلاتے تو دستور کے حساب سے سکریٹری بھی میٹنگ بلا سکتا ہے لہذا آپ سکریٹری سید محمد امین سے کہیے کہ وہ میٹنگ بلائیں جس پر انھوں نے کہا کہ سکریٹری بھی میٹنگ بلانا نہیں چاہتے۔ میں نے کہا کہ اگر سکریٹری اور صدر دونوں خود سے میٹنگ بلانا نہیں چاہتے تو آپ اراکین سوسائٹی کے نصف گیارہ افراد میٹنگ بلائے جانے کی ایک عرض داشت صدر کو دیں اور اس کے بعد بھی اگر وہ میٹنگ نہیں بلاتے تو آپ مجھے لکھئے گا۔ پھر میں دیکھوں گا کہ میٹنگ کیسے نہیں بلائی جاتی۔ ۲۷ مئی کو لکھنؤ واپسی پر صبح فجر کی نماز کے بعد عبدالقدوس صاحب سے ان کے گھر پر پھر ملاقات کی اور چاہا کہ آپ کی مرضی ہو تو مصالحت کی بات کریں مگر وہ اپنے کو اس کے لیے تیار نہ کرسکے۔ بالآخر میں مایوس ہو کر چلا آیا۔ میٹنگ نہ بلائے جانے کے سلسلہ میں ماسٹر نعیم اللہ کا کہنا تھا کہ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں سال بھر میٹنگ نہیں بلاؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ آخر قسم کھانے کی وجہ کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا میں نے دو بار میٹنگ بلائی ایجنڈا گشت کروایا لوگوں نے دستخط کیے لیکن جتنے لوگ میٹنگ میں آئے اس سے کورم پورا نہیں ہوتا تھا نتیجتہً میٹنگ نہ ہو سکی۔ اس جھنجھلاہٹ میں میں نے قسم کھائی کہ سال بھر اب خود سے میٹنگ نہیں بلائیں گے۔

ہاں اگر دس گیارہ افراد میٹنگ بلائے جانے کی درخواست دیں تو میٹنگ بلائی جا سکتی ہے اس ضمن میں سوسائٹی کے ۱۲ اراکین نے اختلافات کو ختم کرانے کی غرض سے میٹنگ بلائے جانے کے سلسلہ میں ایک تحریری درخواست سوسائٹی کے صدر کو دی جس پر ۳ جولائی کو مجلس عاملہ کی جنرل باڈی کی میٹنگ بلائی گئی۔ میں اس میٹنگ میں شرکت کی غرض سے جب بہرائچ پہونچا تو مسٹر عبدالقدوس اور ان کے چند ساتھی جو ہمارے بھی ساتھی تھے یہ کہہ کر میٹنگ میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ میٹنگ غیر آئینی ہے میں نے کہا کہ اب تک تو آپ میٹنگ بلائے جانے کی بات کہہ رہے تھے اور اب میٹنگ میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ سنا رہے ہیں۔ آخر مسئلہ کا حل کیا ہے؟ میں تو میٹنگ میں شرکت کی غرض سے اس لئے آیا تھا کہ میں آپ کی مدد کروں لیکن یہاں مدعی سست اور گواہ چست والا معاملہ ہے تو اس پر انھیں جوش آیا کہنے لگے کہ اچھا کل میں صرف اکیلا ہی میٹنگ میں آؤں گا۔ میں نے کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن کہنے کے بعد بھی وہ تو میٹنگ میں نہیں آئے ہاں ان کے پانچ ساتھی جنھوں نے صدر کے خلاف ایک یادداشت دی تھی وہ میٹنگ میں شریک ہوئے ان پانچ لوگوں میں ڈاکٹر محمد آفاق صاحب ایسے شخص تھے جنھوں نے میٹنگ میں بحث و مباحثہ یہ کہہ کر کیا کہ صدر صاحب ہم آپ کی زبانی صفائی سے مطمئن نہیں ہو سکتے ہیں ثبوت چاہیئے۔ تب ماسٹر نعیم اللہ کو ثبوت پیش کرنے پڑے۔ سوسائٹی کی تاریخ میں ۶/۱ گھنٹہ مسلسل چلنے والی یہ پہلی میٹنگ تھی۔

اس میٹنگ میں صدر سوسائٹی کے خلاف عرضداشت دینے والے جس طرح پانچ حضرات شریک ہوئے تھے، اسی طرح مزید افراد کو بھی شریک ہونا چاہیئے تھا۔ اور دستور کے اس قانونی جواز کے تحت جس کا حوالہ مسٹر عبدالقدوس اب دے رہے ہیں۔ صدر سوسائٹی ماسٹر نعیم اللہ کی صدارت میں میٹنگ ہونے کی مخالفت کرنی چاہیئے تھی۔ اگر وہ میٹنگ میں شریک ہوتے اور اس بات کو اٹھاتے تو ممکن تھا کہ ان کی بات مان لی جاتی۔ بالفرض اگر ان کی بات نہ مانی جاتی تو ان کے لئے آخری چارہ کار میٹنگ سے واک آؤٹ کر جانے کا تھا۔ صرف گھر بیٹھے یہ فیصلہ کر لینا کہ میٹنگ غیر آئینی ہے اور میٹنگ میں شرکت نہ کرنا یہ کس آئین کے تحت تھا یہ میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا۔ میٹنگ میں شریک نہ ہونے کا ایک نقصان یہ ہوا کہ سوسائٹی کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر عبدالقدوس اور مجلس عاملہ کے ایک رکن مسٹر نعیم خاں کے خلاف تادیبی کارروائی جو اخراج کی صورت

میں ہوئی وہ نہ ہو پاتی۔ مزید دو ذمہ دار افراد جن میں سوسائٹی کے نائب صدر اور سکریٹری سنے جس نادہندگی کا ثبوت دیا وہ سوسائٹی کے مفاد میں نہیں تھا۔ جبکہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ چندہ رکنیت جمع نہ کرنے کی بنیاد پر گذشتہ بہت سی میٹنگوں میں بہتوں کا اخراج ہو چکا ہے۔ باوجود نوٹس اور بار بار مطالبہ کرنے کے باوجود بھی ان لوگوں نے چندہ رکنیت جمع نہیں کیا۔ کسی کا دو سال کا تو کسی کا ڈیڑھ سال کا چندہ رکنیت جمع نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دستور کی دفعہ ۳ (د) کے تحت اخراج کی جب بات چلی تو محمد مقبول خاں ایڈوکیٹ نے اس کی مخالفت کی مگر چونکہ گذشتہ میٹنگوں میں بہتوں کا اسی بنیاد پر اخراج ہو چکا تھا اس لئے مجبوراً اس تجویز پر انہیں اتفاق کرنا پڑا۔ اگر وہ مجھے بھی اس میٹنگ میں شریک نہ ہونے کے اس قانونی جواز کو بتا اور سمجھا دیتے تو شاید میں بھی اس میٹنگ میں شریک نہ ہوتا۔ کیوں کہ میری وفاداری ادارے کے ساتھ ہے کسی فرد واحد گروہ جماعت کا میں اندھا طرفدار نہیں ہوں اور نہ میری عادت ممیانے کی ہے یہ بات ہمارے دوست مسٹر عبدالقدوس صاحب خوب جانتے ہیں۔ میں نے ماسٹر نعیم اللہ صاحب کی اندھی حمایت کرنے پر انہیں بھی بارہا ٹوکا ہے جس کا آج بھی وہ انکار نہیں کر سکتے جہاں تک اختلافات کی بات ہے ہمارے نزدیک یہ بری چیز نہیں ہے۔ ہم اختلافات کو ایک اچھی چیز سمجھتے ہیں بشرطیکہ وہ تعمیری ہوں۔ ہم نے اپنے اس موقف کو مسٹر عبدالقدوس پر بارہا واضح کیا ہے اور میرا اپنا یہ کلی نظریہ ہے کہ جن اداروں میں اختلافات کرنے والے نہیں ہوتے اور صرف بے سمجھے بوجھے ہاں میں ہاں ملانے اور اندھی حمایت کرنے والے ہی ہوتے ہیں وہ ادارے بدنظمی اور بے ضابطگی کا اڈہ بن جاتے ہیں لیکن جس طرح سے ان اختلافی مسائل کو ہوٹلوں، سڑکوں اور چوراہوں پر لایا گیا وہ تنظیم کے حق میں ایک اچھی چیز نہیں تھی۔ اور اسی بنیاد پر تادیبی کارروائی کے ضمن میں ان دو حضرات کے نکالے جانے کی ہم نے حمایت کی۔ ابھی ۶؍ اگست کو مسٹر عبدالقدوس صاحب ثالثی بورڈ کے رکن حضرت مولانا اسعد مدنی صاحب سے دلی میں اور لکھنؤ میں مولانا علی میاں سے ملنے کے بعد ملاقات کی غرض سے میرے پاس تشریف لائے تھے۔ اس وقت سوسائٹی سے متعلق کچھ معاملوں کی فوٹو کاپیاں جو ان کی نظر میں بہت اہمیت کی حامل تھیں، مجھے دکھائی اور بہت سی اور گفتگو کے ضمن میں انھوں نے

یہ بھی کہا کہ آپ نے مصالحت کی مخالفت میں ایک تحریری تجویز بھی روانہ کی تھی۔ ان کے ہمراہ مولانا حیات اللہ قاسمی بھی تھے میں نے مولانا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جی ہاں مصالحت تو مولانا سے ہو سکتی ہے اس لئے کہ وہ ابھی سوسائٹی میں موجود ہیں لیکن جو لوگ سوسائٹی سے نکالے جا چکے ہیں۔ ان سے مصالحت کی بات اب ہمارے سمجھ میں نہیں آتی۔ کیوں کہ مصالحت کے اوقات ضائع کردیے گئے ہیں۔ ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ اگر آج بھی آپ ہمیں مطمئن کردیں تو میں بغاوت کرنے پر آمادہ ہوں۔ حالانکہ یہ اختلافات معمولی نوعیت کے تھے بشرطیکہ وہ طے کئے جاتے یا کرائے جاتے۔ مگر افسوس کہ وہ معزز ہستیاں بھی جن پر قوم کو ناز تھا انھوں نے بھی کوئی کوشش اس میں نہیں کی۔ پہلی معزز ہستی سرپرست مولانا ذکر اللہ صاحب کی تھی اور دوسری ثالثی بورڈ کے رکن مولانا کلیم اللہ نوری کی تھی۔

سوسائٹی کے سرپرست مولانا ذکر اللہ صاحب جونکہ مقام پر تھے۔ وہ اس بحران میں زبردست رول ادا کر سکتے تھے وہ فریقین میں مصالحت کرا سکتے تھے اور بحرانی کیفیت کو ختم کرا سکتے تھے مگر انھوں نے اس سلسلہ میں کسی بھی فریق سے بات نہیں کی اور مسئلہ طول پکڑتا چلا گیا۔

چونکہ بعض لوگ دل کے اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ وہ معمولی حالات میں ہی اپنے حواس کھو دیتے ہیں اور جب ان پر ایک دو کا دباؤ پڑ جاتا ہے یا حالات بہت زیادہ دگرگوں ہو جاتے ہیں۔ تو ان کی حالت اور بھی خستہ ہو جاتی ہے عقل کام نہیں کرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوشی اختیار کر لیتے ہیں۔

ان میں حالات سے نبرد آزما رہنے اور اپنے نظریہ اور اصول کے مطابق مسئلہ کا حل ڈھونڈھ نکالنے کی بھی جرأت اور ہمت نہیں جٹا پاتے اور آندھی کے جھونکوں میں تنکوں کی طرح ہچکولے کھاتے رہتے ہیں یا کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ مولانا ذکر اللہ صاحب کا استعفا اسی گھبراہٹ کا نتیجہ ہے۔ بظاہر وہ بہت ہی نیک اور سیدھے سادے فرشتہ صفت انسان ہیں۔ مگر ان میں وہ جرأت و ہمت نہیں کہ وہ اس مسئلہ میں کوئی رول ادا کرتے انھوں نے استعفیٰ دے کر اپنی جان تو چھڑا لی مگر ادارے کو ایک زبردست بحران سے دوچار کر گئے۔ دوسری اہم

شخصیت مولانا کلیم اللہ نوری کی تھی جو ثالثی بورڈ کے ایک رکن بھی تھے۔ وہ اس بحران کو حل کرنے میں اہم رول ادا کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے بھی اس معاملہ میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ معاملہ جب انتہا کو پہونچ گیا تب انھوں نے کچھ سرگرمی دکھائی مگر چونکہ ان کے صاحبزادے مولوی حیات اللہ صاحب جانبدارانہ گروہ بندی کی سیاست میں اہم رول ادا کر رہے تھے اس لئے مولانا کی شخصیت لوگوں کی نظر میں اور خصوصاً ایک گروہ کی نظر میں مشکوک ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کوششوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

اب رہی استعفیٰ کی بات چاہے وہ سرپرست کا استعفیٰ ہو یا کسی اور کا سوسائٹی کے مفاد میں نہیں تھا نہ میری سمجھ سے یہ استعفیٰ عقلمندی پر مبنی تھا۔ کیونکہ ادارے کی بہبود کے لئے ایسے مخالف گروہ کا رہنا ضروری تھا جو غلط بات پر روک ٹوک کرے اور اگر اسی طرح لوگ یکے بعد دیگرے استعفیٰ دے کر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتے رہے تو پھر ادارے کی محافظت کسی خاص گروہ جماعت و فرد کے ہاتھوں میں مقید ہو جانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہو گی؟

مولانا حیات اللہ قاسمی کا منافقانہ رول

ماسٹر صاحب کی مقبولیت و ہر جگہ ان کی پوچھ، دوسرے اکابرین سے ان کے گہرے روابط سے حضرت مولانا کلیم اللہ نوری تو بے چین نہیں ہوئے۔ لیکن ان کے صاحبزادے مولانا حیات اللہ قاسمی کی بے چینی ضرور بڑھ گئی۔ اور یہ سلسلہ ۱۹۸۱ء سے شروع ہوا جبکہ پانچویں ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس بہرائچ میں ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس کا افتتاح سید حامد صاحب کو کرنا تھا۔ مولانا نے سید حامد کی ذات کو اپنی ناراضگی کا بہانہ بنالیا۔ کیونکہ حضرت مولانا اسعد صاحب بھی سید حامد صاحب کے مخالف تھے۔ اسی موزوں کو لے کر مولانا حیات اللہ قاسمی نے سوسائٹی کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ لیکن حضرت مولانا کلیم اللہ نوری جو سوسائٹی کے ثالثی بورڈ کے رکن تھے۔ ان کے کہنے پر استعفیٰ منظور نہیں ہوا۔ مولانا مجلس عامہ کے رکن بنے رہے۔ لیکن ماسٹر صاحب کے خلاف مولانا کی حاسدانہ و منافقانہ سرگرمیاں و ریشہ دوانیاں جاری رہیں سوسائٹی کے ۸۸ء کے بحران میں اس منافقانہ کردار کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔ مولانا کے منافقانہ رول سے ماسٹر صاحب کی شخصیت بھلے کچھ متاثر ہوئی ہو۔ ورنہ اس سے ان کا کچھ

بگڑا نہیں۔ جو بھی کچھ بگڑا ان کی اپنی ذات وکمزوریوں سے بگڑا اور انھوں نے ۹۰ء کے بعد سے توانائیت نخوت اور گھمنڈ کے نشے میں چور ہو کر مصالح اور انجام کار سے غافل ہو کر چلنے کا من بنالیا۔ نہ افراد کے جذبات کا خیال رکھا نہ جماعت کے مفاد کا۔ انھیں گلاہ شکوہ تو دوسروں کا رہا۔ گویا ہم تو بالکل ٹھیک اور کوتاہیاں صرف دوسروں سے ہو رہی ہیں اور انھیں اپنا جائزہ لینے و اپنا محاسبہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ "انسان کا سب سے بڑا دشمن خود اس کا اپنا نفس ہے جو اس کو فریب میں مبتلا کر کے برباد کر دیتا ہے۔ اگر مسلمان اپنے نفس کا جائزہ نہیں لیتا اور اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں۔ تو اس کے جوتوں کی چاپ ضعیف انسان کے دل کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے"۔

بطور ثالث حضرت مولانا اسعد مدنی دامت برکاتہم کی بہرائچ آمد

۳ جولائی ۸۸ء کی میٹنگ میں جب ماسٹر نعیم اللہ کو کھلی فتح حاصل ہو گئی تو مخالف گروپ کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ اب وہ معاملات کو طے کرانے کے لیے حضرت مولانا اسعد مدنی و مولانا علی میاں کے پاس دوڑنے لگے۔ کیونکہ یہ دو معزز ہستیاں سوسائٹی کے ثالثی بورڈ کے رکن تھے مولانا علی میاں نے مخالف گروپ کو سمجھانے کی ہر طرح کوشش کی لیکن وہ بار بار شکایت و فریاد لیکر مولانا کے پاس جاتے رہے۔ بالآخر مولانا نے تنگ آکر صدر سوسائٹی کو استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ پھر کیا تھا اب دوڑ مولانا اسعد صاحب کے یہاں شروع ہو گئی۔ اس دوڑ کے نتیجہ میں ۲۸ اگست ۱۹۸۸ء حضرت مولانا اسعد صاحب بحیثیت رکن ثالثی بورڈ تشریف لائے۔ اور دونوں فریقین کی باتوں کو سن اور سمجھ کر معاملات کو طے کرانے کی کوشش کی اور معاملات طے ہو گئے۔ جو اہم معاملے طے ہوئے۔ ان میں یہ تھا کہ ماسٹر نعیم اللہ سوسائٹی سے متعلق کوئی کام بغیر مشورہ نہیں کریں گے۔ دوسرے جو لوگ سوسائٹی سے نکالے جا چکے ہیں۔ یا جنھوں نے از خود استعفیٰ دے دیا ہے۔ انھیں دوبارہ سوسائٹی میں شامل کر لیا جائے۔ بشرطیکہ وہ تحریری یقین دہانی کرا دیں کہ وہ سوسائٹی کے مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے۔ جس سے سوسائٹی کا وقار مجروح ہو۔

تحریری یقین دہانی کا یہ فیصلہ مخالفین کے گلے کی ہڈی بن گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب لوگوں نے لکھ کر دیا نہیں۔ تو سوسائٹی میں لیا بھی نہیں گیا اور یہ جو کچھ ہوا اس میں مصالحت کم سیاست زیادہ تھی

مصالحتی کوشش پر ہفتہ وار قومی ترجمان لکھنؤ کا تبصرہ

گذشتہ ہفتہ "قومی ترجمان" میں بہرائچ کی ملی سوسائٹی اور اس کی باہمی رسہ کشی کے بارے میں جو تحقیقاتی تجزیہ پیش کیا گیا تھا گذشتہ دنوں تائتی بورڈ کے رکن مولانا اسعد مدنی کی مصالحتی کوشش سے اس کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں کو بلا سودی قرض فراہم کرنے والی ہندوستان کی دوسری سب سے بڑی تنظیم ٹوٹنے سے بچ گئی۔ گذشتہ ۲۸ اگست کو حضرت مولانا اسعد مدنی نے بہرائچ پہنچ کر فریقین سے گفتگو کر کے معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی۔ مولانا کی کوشش سے سوسائٹی کی کشتی بھنور سے نکل کر کنارے آ لگی ہے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ دلوں کے فاصلے ختم ہوں۔ لوگ اپنی غلطیوں پر پشیمان ہوں ہر ایک ایک دوسرے کی غلطی کو در گذر کریں پھر باہمی اتحاد و اتفاق اور یگانگت سے لوگوں میں ٹوٹے ہوئے اعتماد کی بحالی کی مشترکہ جدوجہد کریں اور یہ دونوں فریقوں کی قربانیوں پر منحصر ہے۔ ملّت کا مفاد بہر حال ذاتی مفاد اور ذاتی اختلافات سے زیادہ بڑا اہم اور ضروری ہے۔ ملت کے مفاد کی خاطر ذاتی مفاد اور انا کے جذبہ کی قربانی کا نام ہی خدمت ہے۔

(بحوالہ ۹ تا ۱۶ ستمبر ہفتہ وار قومی ترجمان لکھنؤ)

ہماری اپنی کوشش

حضرت مولانا کے چلے جانے کے بعد میری کوشش یہی رہی کہ تحریری یقین دہانی کی شرط کو اگر ختم کر دیا جائے۔ تو معاملہ سب برابر ہو جائے اور اس سلسلے میں ہم نے ماسٹر صاحب سے کہا بھی۔ مگر وہ کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ الٹے ترش رو ہو گئے۔ اس کے بعد ہم نے حاجی منظور[1] صاحب اور

---

[1] حاجی منظور صاحب تاجر تھے اور تاجر ہونے کی وجہ سے سوسائٹی کے لئے دوڑ بھاگ تو نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن رائے مشورے میں برابر شریک رہتے اور اکثر ماسٹر صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے اور یہی کہتے تھے کہ ماسٹر صاحب جو سوچ رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ نیک طبیعت، ایماندار و دیانت دار تھے۔ انھیں ادارے کی تو ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ادارے کو ان کی ضرورت ضرور تھی۔

سید وصی الدین کے لئے جانے کی بات کی۔ تب بھی وہ راضی نہیں ہوئے۔ الٹے کچھ کہنے کے بجائے انھوں نے یہ کیا، انھوں نے یہ کیا۔ اس طرح لئے جانے کا اب کوئی سوال نہیں۔ بصورت دیگر سکریٹری سید وصی الدین پر بات ٹک گئی اور کافی سمجھانے بجھانے کے بعد بھی وہ کسی طرح راضی نہیں تھے۔ میں نے کہا کہ وہ کتنے برے ہی سہی لیکن پھر بھی سوسائٹی کے حق میں موزوں ترین آدمی ہیں۔ آپ کی کمیٹی میں وہ کون ہیں؟ اور کتنے ہیں؟ جنھیں سوسائٹی سے دل چسپی ہے۔ نام لینے اور کہنے کو تو ممبر بہت ہیں۔ لیکن آپ کے بعد؟ اس لئے جن کی کچھ قربانیاں ہیں۔ انھیں ہی زیادہ لگاؤ ہو سکتا ہے۔ آخر سب کچھ کہنے کے بعد پھر وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے۔ پھر بھی ان کے حلق سے وصی صاحب کو لینے کی بات نہیں اتر رہی تھی کہ میں نے سیاسی جوڑ توڑ کی ایک تجویز بھی رکھ دی کہ اگر آپ وصی صاحب کو لے لیتے ہیں۔ تو اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ مخالفین کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اور وصی صاحب کو اپنے سے ملانے کا یہ بہتر موقع ہے۔ بہتر موقع اس لئے تھا کہ مسلم فنڈ نجیب آباد کے منیجر اظہار الحق ذکی صاحب کا ایک خط آیا تھا۔ جس میں انھوں نے وصی صاحب اور ماسٹر صاحب کو کسی پروگرام میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی اور یہ غالباً ستمبر ۱۹۸۸ء کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ اس طرح لئے جانے اور نہ لئے جانے کے موزوں پر رات دو بجے تک میری گفتگو ماسٹر صاحب سے ہوتی رہی۔ بمشکل پھر وہ راضی ہو گئے۔ خدشہ تھا کہ صبح ہوتے ہی پھر کچھ نہ سوچ لیں اور بدل جائیں۔ اس لئے صبح ہوتے ہی نماز فجر ادا کرنے کے کچھ دیر بعد۔ میں نے کہا تو پھر اب آپ خط لکھ دیں۔ آپ نے خط لکھا اور اسی وقت خط وصی صاحب کو بھجوا دیا گیا۔ وصی صاحب شام کو تشریف لے آئے۔ ماسٹر صاحب اور وصی صاحب کی بات چیت ہوئی۔ دوسرے دن میں لکھنؤ چلا آیا۔ وصی صاحب کے آجانے کے بعد گروہ مخالفین کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ ان کے اتحاد کی قوت ٹوٹ گئی۔ وصی صاحب کی ایسی کی تیسی اور نہ جانے کیا کچھ گروہ مخالفین میں انھیں کہا جانے لگا لیکن افسوس کہ وصی صاحب اُدھر سے تو برے ہوئے ہی۔ ادھر بھی انھیں کسی نے کیا خود ماسٹر صاحب نے بھی اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ الٹے ان کی تذلیل[1] و تحقیر کر کے ان کا

---

[1] غلام مصطفیٰ وارثی عرف اچھن کے ذریعہ تذلیل و تحقیر کا سلسلہ جاری رہا

مذاق اڑایا جاتا رہا۔ جبکہ اس شخص نے کبھی کسی موقع پر بھی سوسائٹی کے مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ الٹے برے حالات میں ماسٹر صاحب سے اختلاف رکھنے کے باوجود اس نے سوسائٹی میں لاکھوں روپیہ جمع کر کے مدد کی۔ اور اس طرح ۱۹۹۲ء تک انھوں نے چاہے ان چاہے۔ اپنی وابستگی سوسائٹی سے بنائے رکھی۔

لکھنؤ سوسائٹی کا قیام ۲۲ جنوری ۸۹ء

فتح حاصل ہوجانے و مصالحتی کوششوں پر مکمل پانی پھر جانے کے بعد ماسٹر صاحب کا رویہ کافی کچھ اعتدال میں آگیا تھا۔ بگاڑ کی سوچ میں بھی خاصی کمی آگئی تھی سوسائٹی کی بحرانی حالت ختم ہوچکی تھی۔ انہی دنوں حافظ اکرام احمد خاں صاحب کا سندیشہ لے کر تقریباً دو بار سید وکیل احمد ہاشمی بہرائچ پہنچے اور انھوں نے بقول سید ہاشمی حافظ صاحب کا قول نقل کیا کہ "ماسٹر صاحب سے کہہ دو اگر انھوں نے لکھنؤ میں سوسائٹی نہیں کھولی تو ہم حشر میں ان کا دامن پکڑیں گے" بس اس بات نے ماسٹر صاحب کو لکھنؤ میں سوسائٹی کھولنے پر آمادہ کر دیا۔

ظفریاب جیلانی ایڈووکیٹ، ماسٹر صاحب، حافظ اکرام احمد خاں صاحب تینوں نے مجھ سے لکھنؤ کی ذمہ داری سنبھالنے کی بات کہی اور کافی کچھ دباؤ ڈالنے کے بعد بھی۔ میں اپنے کو کسی طرح تیار نہیں کر پا رہا تھا۔ دوسرے دن پھر مشورہ ہوا۔ بالآخر مجبور ہوکر مجھے حامی بھرنی پڑی۔ ۲۲ جنوری ۸۹ء کو میٹنگ کا پروگرام طے کر دیا گیا۔ اور اخبارات میں خبر شائع ہوگئی۔ سوسائٹی قائم ہونے کی خبر شائع ہوتے ہی کئی خیر مقدمی مراسلے "قومی آواز" میں متعدد لوگوں کے شائع ہوئے۔

۲۲ جنوری ۸۹ء کے جلسے کے لیے دو سو سے زائد شہر کے معززین کو دعوت نامے بھیجے گئے بمشکل شہر کے دس افراد شریک ہوئے۔ حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی کی صدارت میں میٹنگ ہوئی۔ مسلم امدادی فنڈ بارہ بنکی کے صدر مولانا محمد ایوب قاسمی کی دعا پر جلسہ کا اختتام ہوا۔ جلسہ میں ماسٹر نعیم اللہ نے کہا کہ "ہم افراد کی کثرت و قلت کی بنیاد پر کام کی شروعات نہیں کرتے بلکہ اللہ کے بھروسے پر صرف چند افراد کے جڑ جانے سے ہی کام کی ابتدا کر دیتے ہیں"

(بحوالہ قومی آواز ۲۴ جنوری ۸۹ء)

اس طرح ۱۷ کھاتے پہلے دن کھولے گئے۔ بعد تین چار روز کے کھاتے کھولے جانے کی

مہم کا آغاز کیا گیا کافی دوڑ بھاگ محنت و جدوجہد کے نتیجہ میں ۱۳ دن میں بمشکل ایک سو پچاس کھاتے اور کھولے جا سکے۔ (تعداد کھاتہ بحوالہ ۷ فروری ۸۹ء قومی آواز)

ابتدا میں جن لوگوں نے لکھنؤ سوسائٹی میں کھاتہ کھولے جانے میں تعاون دیا۔ ان میں ہمارے چھوٹے بھائی محمد وسیم ندوی، عقیل اللہ عرف شاہد ندوی۔ پٹری دوکاندار نور محمد اور ہمارے دوست و محسن جناب چودھری شمس الحسن قابل ذکر ہیں۔ قرض کی ابتدا ۱ فروری ۸۹ء سے کی گئی۔ ابتدا میں سوسائٹی کا دفتر "کاشانہ اکرام" باغ قاضی میں رہا۔

لکھنؤ بلڈنگ کی خریداری

۲ جون ۸۹ء کو لکھنؤ مولوی گنج کی بلڈنگ خریداری عمل میں آئی۔ یہ بلڈنگ تین اداروں کے اشتراک سے خریدی گئی مسلم فنڈ نجیب آباد۔ ملی امدادی سوسائٹی بہرائچ و ملی سوسائٹی لکھنؤ کی طرف سے حافظ اکرام احمد خاں صاحب نے دولاکھ پچاسی ہزار چار سو روپیہ بہرائچ ملی سوسائٹی کی طرف سے ماسٹر نعیم اللہ نے دو لاکھ چھہتر ہزار چار سو پچاس روپیہ اور مسلم فنڈ نجیب آباد نے تین لاکھ تیس ہزار روپیہ بلڈنگ خریداری میں دیئے۔ اس طرح کل نو لاکھ پندرہ ہزار تین سو پچاس روپیہ بلڈنگ خریداری میں خرچ ہوئے۔ لیکن رجسٹری کی تکنیکی غلطی کی بنیاد پر صرف دو اداروں کی مشترکہ ملکیت ہی ٹھہری اور لکھنؤ سوسائٹی اس خریداری سے باہر ہو گئی یہ بات جب حافظ اکرام احمد خاں صاحب کو معلوم ہوئی تو انھوں نے اسے ایک سازش سے تعبیر کیا۔ حالانکہ یہ سب کچھ لاشعوری طور پر ہوا اس میں ماسٹر صاحب و ذکی صاحب کا کوئی قصور نہیں تھا یہ غلطی وکلا و منشی حضرات کی خود کی اپنی تھی۔ بلڈنگ خریداری کے وقت ماسٹر محمد نعیم اللہ جناب ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ۔ جناب مہتاب علی خاں ایڈوکیٹ جناب سید وکیل احمد ہاشمی، محمد قمر الدین صدیقی ایڈوکیٹ۔ محمد عارف، حافظ اکرام احمد خاں۔ قاضی اظہار الحق ذکی

لہ جس کے نتیجہ میں حافظ اکرام احمد خاں صاحب نے شدت سے مانگ شروع کر دی ملی سوسائٹی سے دوری بڑھ گئی۔ کاشانہ اکرام باغ قاضی کا سوسائٹی کا دفتر مولوی گنج منتقل کرنا پڑا اور حافظ صاحب کا روپیہ واپس ہو گیا

اور یہیں خود موجود تھا۔ بلڈنگ خریداری کے بعد اس کی ریپیرنگ و بناؤ سنگار پر ایک لاکھ باون ہزار تین سو آٹھ روپیہ مزید اور خرچ ہوئے۔ ۱۳ر مارچ ۱۹۹۰ء کو فی دوکان دار کو نوے ہزار کے حساب سے روپیہ دے کر تین دوکانیں خالی کرائی گئیں۔

حضرت مولانا علی میاں کے ہاتھوں افتتاحی تقریب

۱۵ر اگست ۱۹۸۹ء کو حضرت مولانا علی میاں کی صدارت میں افتتاحی تقریب ہوئی اور مولوی گنج میں سوسائٹی کی شاخ کا قیام عمل میں آیا جس میں شہر لکھنؤ کے معززین کی خاصی بڑی تعداد شریک ہوئی۔

بلا سودی سوسائٹیوں کی کل ہند کانفرنس و علی میاں کی تقریر

۲۸، ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۹ء کو لکھنؤ میں بلا سودی سوسائٹیوں کی کل ہند کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ اس کانفرنس میں ۳۵ تنظیموں کے نمائندے شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ جس کی استقبالیہ کمیٹی کا چیرمین چودھری شرف الدین[لہ] کو بنایا گیا۔ چودھری صاحب نے کانفرنس میں خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی دامت برکاتہم نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا۔ "دولت جب کچھ ہاتھوں میں منجمد ہو جاتی ہے تو اس سے سماج میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ سونا، چاندی ہو یا روپیہ اس پر جمود طاری نہیں رہنا چاہیئے۔ جس طرح ہوا حرکت میں، پانی حرکت میں رہتا ہے۔ اسی طرح سونا اور چاندی و دولت بھی رواں دواں رہنا چاہیئے۔ لیکن اگر یہ رک جاتا ہے۔ تو جس طرح رکے ہوئے پانی کی وجہ سے تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پوری زندگی سماج اور تمدن میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور یہ خرابی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ انسان ایک دوسرے کو

لہ چودھری صاحب لکھنؤ کے ان مخیر حضرات میں ہیں جنھیں اکثر و بیشتر ملی مسائل پر لکھنؤ میں ہونے والی کانفرنس کے منعقد ہونے کی میزبانی کا شرف حاصل رہا ہے۔ آپ نہایت غریب پرور ملت کے مسائل پر فکر مند و متحرک رہتے ہیں "انجمن ترقی اتر پردیش" کے جنرل سکریٹری ہیں۔ اور ہر سال اسلامیہ کالج میں ہونے والے جلسہ جشن رحمت العالمین کے منتظم اعلیٰ و سرپرستوں میں ہیں۔

کھانے لگ جاتا ہے۔ آج ملک میں روپیہ و دولت کے لالچ ہی نے کرپشن پیدا کیا ہے۔ سودخوری اسی لالچ کا حصہ ہے۔

انھوں نے کہا کہ اس قسم کے بلاسودی ادارے پورے ملک میں پھیلانے چاہیئے تاکہ ضرورت مند اپنی ضرورت کی تکمیل سود خور مہاجنوں کے بجائے ایسے اداروں سے کرسکیں۔ کیونکہ سودی لین دین نے کتنے باعزت خاندانوں کی عزت کو خاک میں ملادیا ہے۔ اگر مسلمان اس ملک میں اپنا تشخص اپنی افادیت و ضرورت ثابت کرنا چاہتے ہیں تو انھیں چار باتوں پر توجہ دینا ہوگی (۱) اخلاقی بگاڑ سے بچانے کا کام (۲) اقتصادی حالت درست کرنے کے لئے رفاعی ادارے قائم کریں (۳) تعلیم پر دھیان دیں اور مکاتب کے جال جگہ جگہ پھیلاکر اپنے بچوں کو دین اسلام سے اس حد تک روشناس کرائیں کہ موجودہ نظام تعلیم ریڈیو۔ ٹی وی ہمارے بچوں کے عقائد کو خراب نہ کرسکیں اور چوتھے قانونی طور پر شرعی عدالتوں کو قائم کریں فضول خرچی سے بچیں۔

(بحوالہ قومی آواز ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۹ء)

صدر جلسہ جسٹس قاضی مجیب الدین

جلسے کی صدارت ناگ پور ہائی کورٹ کے جسٹس قاضی مجیب الدین نے کی قاضی صاحب نے سود کو ظلم سے تعبیر کیا۔ انھوں نے کہا کہ قاتل سے تو رحم کی امید کرسکتے ہیں۔ لیکن سودخوار سے نہیں کرسکتے۔ سود کی خرابی و نقصانات کا اندازہ ہماری قوم کو نہیں ہے۔ میں نے کتنوں کو سودخوروں کے پھندوں میں پھنستے اور تباہ ہوتے دیکھا ہے اور جو اس پھندے میں پھنسے وہ کبھی ابھر نہیں سکے اور یہ صرف مسلمانوں کا ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہمارے پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ آج ملک کی ۹۰ فی صد دولت دس لوگوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہے اور دس فی صد دولت ۹۰ فی صد میں بٹی ہوئی ہے۔ کانفرنس کو خطاب کرنے والوں میں ملی سوسائٹی کے صدر ماسٹر محمد نعیم اللہ، قاضی مشرف حسین، حضرت مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی، جناب عبدالوہاب دلوی۔ فیضو کے سکریٹری و مسلم فنڈ نجیب آباد کے منیجر جناب اظہار الحق ذکی مولانا سید محمد سلمان حسنی ندوی۔ نظامت کے فرائض ملی سوسائٹی بہرایچ کے سکریٹری سید وصی الدین

و مولانا محمد ایوب قاسمی نے انجام دیئے۔

(بحوالہ ۹؍ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۸۹ء قومی آواز لکھنؤ)

(۱۳؍ اکتوبر ۱۹۸۹ء روزنامہ عزائم لکھنؤ)

لکھنؤ ملی لاج کا افتتاح

۲۹؍ جنوری ۱۹۹۰ء کو اتر پردیش سرکار کے وقف منسٹر مسٹر محمد اعظم خاں نے لکھنؤ ملی لاج کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر شہر کے معززین کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔

ہمارے فکر و عمل کی تبدیلی بگاڑ کی دوسری ابتدا

بلاسودی سوسائٹیوں کی کانفرنس بے حد کامیاب رہی لیکن یہ کامیابی ہمارے لئے نیک شگون ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس کامیابی کے بعد پھر ہماری سوچ و فکر دل کا محور دھیرے دھیرے بدلتا چلا گیا جس طرح ۱۹۸۶ء میں ہم بدلاؤ کی راہ پر چل پڑے تھے۔ وہی صورت حال ۱۹۹۰ء میں پھر پیدا ہو گئی ہم میں ایثار و قربانی کا جذبہ کمزور پڑتا گیا۔ خود غرضی۔ خود پرستی و خود نمائی کے امراض میں ہم پھر گرفتار ہوتے گئے۔ ہم کو اپنا محاسبہ اور جائزہ لینے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ ہمارے کام کے طریقہ کار میں دھیرے دھیرے احساس برتری اور خود نمائی کی جھلک نمایاں ہونے لگی جس کے نتیجہ میں ہم میں مادی اور اخلاقی کمزوریاں بڑھیں۔ لب و لہجہ میں نرمی کے بجائے کڑک و جھلاہٹ، ہم اور صرف ہم کا نشہ، خلاف مرضی کچھ کہنے پر ناگواری و ناداخی کے آثار، ہر وہ شخص ہمارے لئے قابل اعتماد نہیں رہا۔ جس نے ہمارے جذبات اور ضد کے برخلاف معقولیت کا رویہ اپنانے کی بات کہی۔ یہ ایسی کھلی ہوئی کمزوریاں تھیں جس کو ہم نے محسوس کیا۔ اور متعدد بار ہم نے موقع محل و مصلحت کا لحاظ رکھتے ہوئے سیدھے نہ کہہ کر گھما پھرا کر بات کہی تاکہ برا بھی نہ مانیں اور سمجھ بھی جائیں۔ لیکن افسوس کہ ہمارے فکر و عمل میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا۔ اور آئے بھی کیسے جب کوئی اپنی ہی دھن میں ہو تو دوسرے کی دھن کہاں سنائی دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کوئی بھی ادارہ اپنی بلند و بالا عمارتوں و بلڈنگوں کی شان و شوکت۔ لاتعداد پراپرٹی بنا لینے کے گھمنڈ کے سہارے کب تک زندہ رہ سکتا ہے؟..... کسی ادارے کے باقی رہنے اور ترقی کرنے کی سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ادارے کے ذمہ داران کا صحیح فکر و عمل ہے۔ اگر یہ نہیں ہے

یا اس کا تناسب کم سے کم ہے۔ تو تاریخ پر نظر رکھنے والا آسانی سے پیش گوئی کر سکتا ہے کہ بھی اب اس ادارے کے دن گنے ہوئے ہیں۔ یہی وہ بنیادی سوچ تھی کہ جس نے مجھے اپنے ماموں جان کو خط لکھنے پر مجبور کیا اور میں نے اپنے دو خطوں میں اس جملہ کو مکرر دہرایا تھا کہ۔۔ "سوسائٹی کا ڈھنچر پنچر نکلنا لازمی ہے۔ اس سے بھاری بھرکم لفظ ہمارے پاس کوئی اور دوسرا نہیں ہے" لیکن افسوس ہمارے ماموں جان نے میرے ان خطوں کو ایک بزدل کی بڑ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ۲۶ر اگست ۹۰ء کو اکونہ[۱] سوسائٹی کھولی جا چکی تھی اور ۱۲ر اکتوبر ۹۰ء کو وزیر گنج میں سوسائٹی کھولے جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ جہاں تک میں نے محسوس کیا کہ ان سوسائٹیوں کے پھیلاؤ کے پیچھے "صرف بڑھک[۲] مارنے کا جذبہ کارفرما تھا اور اسی جذبہ کے تحت دو ماہ کے اندر چار مزید سوسائٹیاں اور کھول دی گئیں۔ ۱۵ر اکتوبر ۹۰ء درگاہ شریف بہرائچ، ۱۶ر نومبر ۹۰ء رسیا بازار، ۲۰ر نومبر ۹۰ء نانپارہ اور ۲۹ر دسمبر ۹۰ء رویہیہ ڈیہہ۔ اس طرح صرف پانچ ماہ کے اندر چھ سوسائٹیاں کھولی گئیں۔ ۱۹۹۰ء کے اختتام کے بعد یہ سلسلہ مزید کم ہونے کے بجائے اور تیز ہو گیا اور مارچ ۱۹۹۱ء تک یعنی تین ماہ میں تین مزید اور سوسائٹیاں

۱ـ اکونہ میں سوسائٹی قائم کی گئی۔ آراضی خرید کر مسجد بنوائی گئی۔ جس میں مدرسہ بھی کھولا گیا۔ دوسروں کی امانتوں سے مسجد بنوانے کا حق کس نے دیا؟ لیکن یہ کون پوچھے؟ اور کس سے پوچھے؟ ان سے جو خود ہی اپنے آپ مفتی اور عالم ہوں۔ اسکول اور مدرسہ بنوانا تو کسی حد تک غنیمت تھا کیوں کہ اس کی آمدنی کے ذرائع سے لوگوں کی امانتوں کی واپسی ہو سکتی تھی۔ لیکن مسجد سے . . . . موجودہ وقت میں یہ سوسائٹی بند ہے۔ یہاں کے کھاتہ دار بھکاریوں کی مانند بہرائچ سوسائٹی کے چکر لگاتے دیکھے جاتے ہیں اور ذمہ دار سوسائٹی کو اچھے الفاظ سے نوازتے ہیں۔

۲ـ حقیقت دل کا حال تو خدا ہی جان سکتا ہے۔ لیکن ظاہری شکلیں۔ بات چیت کے انداز و کام کے طریقہ کار و فکر و عمل میں ہم کو بڑھک مارنے کا جذبہ ہی کارفرما نظر آیا۔ اس میں ہماری آنکھوں اور دل و دماغ کا قصور اگر ہو تو خدا معاف کرے۔

کھول دی گئیں۔ ۲۲؍فروری ۹۱ء جمنا بازار ۲۴؍فروری ۹۱ء بدل چوراہا ۱۳؍مارچ ۹۱ء کو گوپور

کھرگوپور سوسائٹی قائم ہونے کے بعد ہم نے پھر ۱۷؍مارچ ۹۱ء کو ایک لمبا چوڑا خط اپنے ماموں جان کے نام پھر ارسال کر دیا۔ اس خط میں بھی ہم نے اس جملہ کو دہرایا ہے جو میں پیچھے لکھ چکا ہوں کہ "سوسائٹی کا ڈھنچر نیچر نکلنا لازمی ہے۔ اس سے بھاری بھرکم لفظ ہمارے پاس کوئی دوسرا نہیں ہے"۔ من وعن نقل کر رہا ہوں۔

ماموں جان کے نام خط

جناب ماموں صاحب السلام وعلیکم

ضروری تحریر یہ ہے کہ اس وقت لکھنؤ سوسائٹی کی پوزیشن ٹھیک نہیں ہے۔ ایک طرف مسلسل وڈرال ہو رہا ہے اور دوسری طرف آمد بھی بند ہے۔ کیونکہ تین محصلوں میں صرف ایک محصل یوسف صاحب ہی وصولی کر رہے ہیں۔ سلمان ہے نہیں اور اشتیاق صاحب بیمار ہو گئے ہیں۔ ایسی صورت میں بینک میں بھی روپیہ نہیں رہا ہے۔ صرف چار ہزار روپیہ ہی بینک میں پڑے ہیں۔ کل کیا ہوگا اس بات کی فکر لاحق ہے۔ واپسی بالکل بند ہے اور قرض بھی بالکل بند کر دیا گیا اس وقت صورت حال ایسی بن گئی ہے کہ ہزار پانچ سو کا قرض بھی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ صورت حال لکھنؤ[1] کی ہے۔ روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ یہاں کوئی سبیل ایسی نہیں ہے جو کام چل سکے لہذا فوری طور پر بیس پچیس ہزار روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بہرائچ کے بھی حالات بہت دنوں سے ٹھیک نہیں ہیں۔ کب ٹھیک ہوں گے یہ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن حالات جیسے چل رہے ہیں اس میں بننے اور سنورنے کے بجائے بگڑنے کے زیادہ ہیں جو غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ بہرائچ سوسائٹی نے مالی اعتبار سے خواہ کتنی ترقی کر لی ہو اور آگے کتنی ترقی کر لے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سوسائٹی پچھلے پانچ سالوں سے اپنے مقصد کو چھوڑ کر آگے بڑھنے کا کام کر رہی ہے اور یہ کام بھی اگر اعتدال میں رہتا تو اس کی سنگینی اتنی محسوس نہ کی جاتی جتنی آج محسوس کی جا رہی ہے۔ ادارہ متعدد بار بحران سے گذر چکا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم

[1] لکھنؤ سوسائٹی سے کافی روپیہ بہرائچ گیا۔ اس لئے روپیہ کی مانگ کی گئی۔

ی بھر بھی اپنے طریقہ کار میں تبدیلی نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس اس میں اور شدت پیدا ہوئی لکھنؤ سوسائٹی کے قیام اور بلڈنگ خریداری کے بعد سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سوسائٹی اب اپنے مقصد سے بالکل ہٹتی نظر آرہی ہے۔ اس مقصد میں کیا جذبہ اور کیا غرض کارفرما ہے؟...... یہ فکرمندی اور سوچنے کی بات ہے۔ آپ کی جدت نے جہاں ادارہ کو اس عروج پر پہنچایا ہے وہیں اب یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کی جدت لوگوں کی سردمہری اور چاپلوسی نہ صرف ادارہ کی تاریخ کو نقصان پہنچائے گی بلکہ آپ کی عزت و شہرت بھی خاک میں ملائے گی۔ اور اس عزت و شہرت سے خاندان کے افراد[1] بھی وابستہ ہیں جو آج سر اٹھا کر چل رہے ہیں وہ کل سر جھکا کر چلیں گے۔ ایسے حالات مجھے نظر آرہے ہیں۔ کیونکہ آپ اپنی جدت طرازی سے سوسائٹیوں کے جو جال قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں میں بچھا رہے ہیں وہ بھی ایک اچھی علامت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری یہ بات بری لگے لیکن یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے دل کی بات بغیر کسی جھجک اور حیلہ حوالی کے آپ کے سامنے رکھوں اور آگاہ کروں۔ کیونکہ دل کی بات دل میں رکھنا نہ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ اپنے آپ سے دشمنی بھی ہے۔

ایک طرف مخالفین اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف عمل ہیں اور دوسری طرف ہمارے طریقہ کار اور اصولوں میں کوئی تبدیلی بھی نہیں ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی مخالفین سوسائٹی کی مخالفت میں سرگرم رہے ہیں اور نقصان پہنچانے کی ہر کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن کل کے مقابلہ کیا آج ہماری نیتیں وہی ہیں جو کل تھی؟..... کیا ہمارے سوچنے کے ڈھنگ بدلے نہیں ہیں؟... ہم میں جو خلوص کل تھا کیا وہ آج ہے؟.... اور کیا اس میں دن بدن گراوٹ نہیں آرہی ہے؟ ..... یہ سوچنے کی باتیں ہیں۔

لہ خاندان کے افراد کی وابستگی سے مراد وہ لوگ ہیں جو صرف یہ کہہ کر اپنے آپ میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے چچا یا ماموں ملی سوسائٹی کے صدر رہے ہیں۔ ماسٹر صاحب کے صاحبزادگان کے علاوہ خاندان کے کسی فرد کا سوسائٹی سے کوئی لینا دینا نہیں رہا۔ رشتہ کی نسبت سے خاندان کے لوگ ضرور فخر محسوس کرتے ہوں گے۔ اس جملہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

اور یہ خدائی قانون ہے کہ جب خدا کسی کو عروج دیتا ہے تو اس کا زوال بھی یقینی ہے اور ہر زوال کا انحصار دو باتوں پر منحصر ہے۔ اوّل یہ کہ اعتدال کی راہ سے تجاوز کرنا جو عقل نہیں کہتی، اور دوم ہماری نیتیوں کا کھوٹ۔ نیتیں اگر صاف ہیں تو اعتدال سے تجاوز پر بھی خدا کی مدد شامل ہے۔ کیونکہ اس میں عشق کی کارفرمائی ہے۔ لیکن اگر ہماری نیتوں میں فطور پیدا ہو جائے اور خدائی خدمت گاری کے جذبے کے بجائے ناموری یا دوسرے اور قسم کے اغراض ہمارے دل و دماغ کی سوچ پر غالب آجائیں تو زوال بھی یقینی ہے۔ کب اور کس وقت کوئی قہر بحران کی شکل میں نازل ہو جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ میں نے اس سے پہلے بھی لکھا تھا کہ سوسائٹی کا ڈھینچر نیچر نکلنا لازمی ہے اور پھر اسی بھاری بھرکم لفظ کا استعمال کر رہا ہوں اس سے موزوں لفظ شاید کوئی اور میرے ذہن میں نہیں ہے۔

آج ہماری سوسائٹی کا مقصد ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بجائے کچھ اور ہو گیا ہے۔ ملی سوسائٹی کے کارندوں کی مستقبل کی موج مستی کے لئے، گلچھرے اڑانے کے لئے جائداد پہ جائداد خریدنا اور ضرورت مندوں سوسائٹی کے بہی خواہوں کھاتہ داران کو مصیبت میں مبتلا کرنا اور انھیں ان کے وقت پر رقم کا نہ ملنا کیا یہی سوسائٹی کا مقصد ہے؟ ایک طرف غریبوں کے زیورات نیلامی کی بھینٹ چڑھیں اور دوسری طرف مستقبل میں کارندوں کی موج مستی کے لئے جائدادوں پر جائدادیں خرید کر ڈالی جاتی رہیں تاکہ آنے والے کارندے ماسٹر نعیم اللہ صاحب کا نام جپتے رہے۔ اگر یہی خیال غالب ہے اور اسی خیال کے ناطے سوسائٹیوں کے جال بچھائے جاتے ہیں اور انھیں سمیٹ کر اور سنوار کر رکھنے اور بچانے کا خیال پس پشت پڑ گیا ہے۔ تو یہ بانسری ہو سکتا ہے کہ آپ کی زندگی تک ضرور آواز دیتی رہے لیکن آپ کے بعد یہ بانسری بج نہیں[1] سکے گی۔ اور تاریخ جہاں اس کے بنانے اور سنوارنے میں آپ کا نام لے گی وہیں اس کے زوال کے اسباب پیدا کرنے میں آپ کو فراموش بھی نہیں کر سکے گی۔ وہی سپہ سالار دانشمند ہے جو اپنے فوجیوں اور سپاہیوں پر نظر رکھ کر آگے بڑھے۔ خدارا اب بھی کچھ گیا نہیں ہے۔

---

[1] ماسٹر نعیم اللہ کی زندگی میں ہی بانسری فیل ہو گئی۔

سوچنے کا وقت ہے مزید اور کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ آپ نے مجھے بھی اس دولت کے ڈھیر پر بٹھا کر آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے۔

فقط والسلام
محمد شمیم
۱۷ مارچ ۱۹۶۰ء

غور کیجئے کہ ہم نے لکھنے میں کیا کچھ باقی رکھا جو نہ لکھا ہو۔ لیکن افسوس آج ہمارے ماموں جان یہ کہتے ہیں کہ "جب حالات اچھے تھے تو سب ٹھیک تھا اور آج جب حالات خراب ہیں تو تم بھی وہی کہہ اور کر رہے ہو جو دوسرے کہہ اور کر رہے ہیں"۔ جبکہ اس سے قبل بھی دو خط لکھے جا چکے تھے۔ اور خط لکھنے اور کہنے کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا مسلسل چلتا ہی رہا ہے لیکن جب ہم پر "میں اور ہم" کا نشہ ہی سوار ہو۔ تو پھر ہمارا اپنا طریقہ۔ ہماری اپنی سوچ ہماری اپنی رائے ہماری اپنی خواہش ہی سب پر مقدم ہے۔ ہم اچھا کریں تو اچھا ہے ہی۔ لیکن ہم برا کریں غلط کریں تو بھی اچھا ہی کہو۔ ہماری کمزوریوں پر جو انگلی اٹھائے۔ اسے ہم بزدلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دیکھئے نصیحت کے جواب میں نصیحت

بقلم خط۔

محمد شمیم خوش رہو
تمہارا نصیحت شدہ تفصیلی خط ملا۔ شکریہ۔ کسی بھی دینی ملی کام میں جذبہ لگن ہوش کے ساتھ جوش ہو تو خداوند کریم ہر قدم پر مدد و نصرت فرماتے ہیں۔ سوسائٹی کی کارکردگی ترقی اس مختصر وقت میں ہوئی ہے وہ خداوند کریم کی مدد ہی ہے۔ ورنہ مجھ جیسا جاہل شخص ایک سو پچاس عملہ کو ملازم رکھ کر سولہ جگہ پر چلا نہیں سکتا۔ کسی کام کے کرنے کے لیے محنت کے ساتھ ہمت اور لگن عزم اور حوصلہ چاہیئے۔

بزدلی آدمی صرف سوچتا رہتا ہے۔ کچھ کر نہیں پاتا ہے۔ ابھی میں نے صرف دس فی صد کام کیا ہے۔ نوّے فی صد کام باقی ہے۔ خداوند کریم ذریعہ کے طور پر مجھے قبول کرتا ہے یا کسی اور کو دنیا میں آج تک پتہ نہیں کتنے ادارے تنظیم تحریک اور حکومتیں وجود میں آئیں۔ اللہ کو جب تک رکھنا منظور رہا چلی اور ختم ہو گئیں۔ کل کوئی دیکھ نہیں آیا ہے۔ زیادہ احتیاط سوچ فکر کرنے

والے فرد کچھ کر نہیں پاتے صرف سوچتے رہتے ہیں۔ فکر اور سوچ میں فرق بھی ہوتا ہے۔ مایوسی اسلام میں حرام ہے۔ حوصلہ رکھو اللہ مدد کرے گا۔ نشاط[۱] گنج میں گرامت مارکٹ کی تیسری منزل پر تین سو اسکوائر فٹ جگہ یوپی کے ہیڈ آفس کے لئے آج ہی طے کی ہے۔ آج یا کل بیس[۲] ہزار کا چیک ایم آئی بلڈرس پرائیوٹ لمیٹیڈ کے نام کاٹ کر تاج[۳] الدین کے ذریعہ محمد اقبال صاحب ڈائرکٹر کے نام بھجوادیں تاکہ وہ معاملہ بالکل پختہ ہو جائے۔ باقی ملنے پر بات ہوگی۔ وہاں کے ذمہ دار و عملہ کا انتخاب کر لیا ہے۔

(دستخط) محمد نعیم اللہ

۶ مئی ۱۹۹۱ء

میں ماسٹر صاحب کے اس خط پر کوئی تبصرہ تو نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ کیا ماسٹر صاحب کے فکر و عمل میں اس تحریر کا کچھ عکس نظر آرہا ہے یا نہیں۔ یہ لوگوں کے اور ماسٹر صاحب کے خود کے دیکھنے کی چیز ہے۔ بہر حال اس خط کے جواب میں ہم نے خط پھر لکھا۔

ماموں جان کے خط کے جواب میں خط

جناب ماموں صاحب السلام وعلیکم

ضروری تحریر یہ ہے کہ ملی سوسائٹی کے کسی بھی کام کی ذمہ داری مجھ جیسے بے حوصلہ۔ کم ہمت اور بزدل شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ سوسائٹی کی شروعات سے ہم نے اپنا بہت کچھ کھویا ہے۔ میرے بچوں کی تعلیم و تربیت چوپٹ ہو گئی۔ ذہنی پریشانی بڑھی۔ نماز تلاوت ذکر و فکر صحافت۔ مطالعہ کا شوق سب اسی کی نذر ہو گیا۔ ایسی صورت میں ہم نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ میں سوسائٹی کی ذمہ داری سے کنارہ کشی اختیار کر لوں۔ اور یہ فیصلہ بہت سوچ وچار کے بعد کیا ہے۔ لہٰذا آپ جسے کہیں میں اس کو زیورات وغیرہ کا حساب دے کر اپنے کو اس جنجال سے چھڑا لوں

۱۔ خط میں مزید سوسائٹی کھولے جانے کی مخالفت کی تھی۔ اس لئے اس کا جواب نشاط گنج کی صورت میں دیا گیا۔

۲۔ میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ ہم نے اپنے اس بھائی کی جس طرح دلداری و دلجوئی کی۔ اس کا صلہ اس نے بعد تنگی میں مجھے دیا۔ وہ مجھے تا زندگی یاد رہے گا۔ اپنوں پر کبھی دوسرے نہ کرنے کی سیکھ اسی میں ہے گئی۔

مجھے ڈر ہے....

فقط والسلام

محمد تمیم

۱۸؍ مئی ۱۹۹۱ء

نشاط گنج دوکان کی مخالفت

اس خط کے بعد ماسٹر صاحب نے پھر کوئی جواب نہیں دیا اور اس طرح نشاط گنج کرامت مارکیٹ کی دوکان کا معاملہ بھی یوں ہی پڑا رہا۔ کیونکہ ہم نے بیس ہزار کا چیک کاٹ کر نہیں دیا بلکہ دوکان لئے جانے کی مخالفت کی۔ اور اس سلسلے میں حاجی امین بیگ کو سخت سست سنایا کیونکہ وہ نہ صرف دوکان دیکھنے گئے تھے بلکہ ماسٹر صاحب کی ہاں میں ہاں ملانے کو وہ اپنی سعادت سمجھا کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب کو ہماری مخالفت اور چیک کاٹ کر نہ دئے جانے کا جب علم ہوا۔ تو ہٹلر شاہی فرمان بہرائچ سے جاری ہوا۔ مجھے غصہ آیا اور میں نے چیک کاٹ کر دے دیا۔ بعد کو ہوش آیا کہ دوکان غلط لے لی گئی۔ مجھ سے کہا کہ روپیہ واپس کر لو۔ میں نے کہا کہ مجھے نہیں جانا ہے تاج الدین اور سوسائٹی کے دوسرے لوگ درجنوں بار روپیہ کی واپسی کے لئے جاتے رہے۔ لیکن اس نے سن کر نہیں دیا۔ دو بار ہم اور ماسٹر صاحب ساتھ بھی گئے۔ لیکن وہی ٹال مٹول والی باتیں کرتا رہا۔ اور اب تک وہ روپیہ واپس نہیں مل سکا۔

سوسائٹیاں کھلنے کا سلسلہ رکا اور پھر جاری ہو گیا

ہمارے اس کہنے سننے کا شاید کچھ اثر یہ ہوا کہ ۱۰؍ مارچ ۹۱ء کو بھیجے گئے خط کے بعد سے ڈھائی تین ماہ کوئی سوسائٹی نہیں کھولی گئی میں اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ میری مخالفت نے غالباً کچھ اثر دکھایا جس کی وجہ سے سوسائٹیاں اب نہیں کھولی جا رہی ہیں۔ مجھے اس صورت حال سے قدرے اطمینان ہوا۔ لیکن بعد کو پھر یہ سلسلہ چل پڑا اور چار ماہ میں سات مزید سوسائٹیاں کھول دی گئیں۔ تب مجھے خیال ہوا کہ میری مخالفت کا سوسائٹیاں نہ کھلنے میں کوئی دخل نہیں تھا بلکہ کوئی اور وجہ رہی ہو گی جس کی وجہ سے ڈھائی تین ماہ کوئی سوسائٹی نہیں کھلی۔ جو

سوسائٹی کھولی گئیں ان میں ۲۶ رجون ۱۹ء نواب گنج بازار ۱۹ رجولائی ۱۹ء لچھمن پور بازار ۱۲ رجولائی ۱۹ء شاہ سلیم پور ۱۱ راگست ۱۹ء گنڈارہ ۱۷ راگست ۱۹ء بنّاپور ضلع گونڈہ ۱۵ رستمبر ۱۹ء بیرپور اور ۲۰ رستمبر ۱۹ء چلوریہ بازار (دھیان رہے ان سوسائٹیوں کے کھولے جانے کی اطلاع مجھے بہت بعد کو ملی)

(۱۳ راکتوبر ۱۹ء کے خط کی نقل کاپی الگ لگی ہے)

پھر خط ماموں کے نام

لکھنؤ سوسائٹی کا کافی روپیہ بہرائچ پہنچ چکا ہے۔ اب وڈرال بھیج کر یہاں کے حالات کو بگاڑنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ خط اسی ضمن میں تحریر کیا گیا تھا۔

جناب ماموں صاحب السلام وعلیکم

ضروری تحریر یہ ہے کہ بہرائچ سوسائٹی اس وقت جس مالی پریشانی سے دوچار ہے۔ وہ نہ صرف تشویش ناک ہے۔ بلکہ افسوس ناک بھی ہے۔ بہرائچ میں روپیہ کی تنگی اور لکھنؤ سے روپیہ کی مانگ۔ یا وڈرال کا ایک بیک لکھنؤ بھیجنا۔ لکھنؤ کے حالات کو بگاڑ سکتا ہے اور یہاں کے حالات کا بگڑنا اتنا خطرناک ہوگا کہ پھر اس پر قابو پانا بہت ہی مشکل ہوگا۔ آپ کے یہاں سے یک بیک گیارہ ہزار کے وڈرال بھیجے جانے کے بعد لکھنؤ سوسائٹی میں وڈرال پھنستے پھنستے ہی رہا۔ جب سلمان کی آدھی وصولیابی سے پورا کیا جاسکا۔ اس وقت یہاں جس طرح گاڑی چل رہی ہے۔ وہ بھی کچھ ٹھیک

لے یہ سبھی سوسائٹیاں گھاٹے میں چلتی رہی ہیں ان میں زیادہ تر ختم ہو چکی ہیں اور جو بچی ہیں انھیں بھی عنقریب ختم ہونا ہی ہے

لے بہرائچ سوسائٹی میں جب کھاتہ دار کو روپیہ دینے کو نہیں رہا۔ تو اس کو لکھنؤ سوسائٹی بھیج دیا کہ روپیہ وہاں سے لے لو۔ اور یہ ایک دو مرتبہ کی بات نہیں ہے۔ درجنوں بار اس طرح کے وڈرال لکھنؤ کو کرنے پڑے ہیں۔ جبکہ لکھنؤ سوسائٹی کا ڈھائی تین لاکھ روپیہ بہرائچ کے ذمہ بطور ایڈوانس تھا۔ مزید وڈرال کا بوجھ یہ الگ سے۔

نہیں ہے۔ بینک میں صرف بارہ سو روپیہ پڑا ہے۔

اس صورت حال پر سوسائٹی کو چلانا کوئی اچھی چیز نہیں ہے اور نہ اس صورت حال کو پیدا کر کے ترقی کے کارنامے جگانا کوئی بڑی چیز ہے۔ ۱۹۸۳ء کے بحران سے لے کر آج تک کے بحران اور حالات ہماری نظر کے سامنے ہیں۔ اور وہ منظر بھی ہمارے سامنے ہے۔ جب باوجود منع کرنے کے مولانا علی میاں سے مدد کئے جانے کی بات نہ صرف سوچی تھی۔ بلکہ اس سلسلے میں خط تک مولانا کو تحریر کر دیا تھا لیکن چونکہ یہ بات میری حلق سے نہیں اترتی تھی کہ ان کے سامنے دست سوال دراز کیا جائے۔ اس لئے وہ خط ہم نے آپ سے حاصل کر لیا تھا۔ جو آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ہم نے ترقی کتنی ہی کیوں نہ کر لی ہو۔ لیکن آج بھی ہم بھکاری ہی ہیں۔ معمولی سے بحران کو ہماری سمجھ سے ادارہ بغیر بھیگ مانگے جھیل نہیں سکتا۔ اور اب تو حالات ایسے بنتے جا رہے ہیں کہ اپنے ہی اب مدد کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کتنے ایسے ہیں جو آپ کے سامنے کچھ اور آپ کے پیٹھ پیچھے کچھ کہتے ہیں...... مزید وضاحت سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ اب حالات اور وقت کی نزاکت پر نگاہ رکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں...... کہ بھیک مانگنے کی نوبت نہ پڑے۔ لیکن ابھی بھی اگر ہم نے نہیں سوچا تو ہماری یہ بے احتیاطی ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دے گی یہ سوچنے کی چیزیں ہیں۔ اُس وقت کے حالات اور اب کے حالات میں بہت فرق ہے اِس وقت جس طریقہ سے آپ چل رہے ہیں۔ وہ طریقہ میری اپنی رائے میں اب بالکل غلط ہے۔ بالکل غلط ہے۔ بالکل غلط ہے۔ خدا واسطے اس پر غور کریں۔ میں نہ بزدل ہوں اور نہ کم ہمت۔ ہاں کمزور ضرور ہوں۔ یہی میری آپ سے گذارش ہے۔ اگر آپ میری اس رائے کو بزدلی پر محمول کرتے ہیں۔ تو ہمیں اپنی اس بزدلی پر ناز ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا۔ اور اب بھی لکھ رہا ہوں۔ اور آئندہ بھی لکھتا رہوں گا۔ کہتا رہوں گا۔ گیارہ ہزار کے وڈرال کے بعد سے برابر اب تک پوزیشن پر خطر چل رہی ہے۔

فقط والسلام

محمد شمیم

۱۳؍ اکتوبر ۱۹۹۱ء

غور کیجئے اس خط پر بھی ..... لیکن افسوس کہ ہماری خود نمائی، خود پسندی اور خود سری نے ہمیں غور کرنے و سوچنے تک کا موقع نہیں دیا۔ سوسائٹی کے حالات اتنے خراب ہیں کہ لوگوں کا وڈرال نہیں ہو پا رہا ہے اور مسلسل روپیہ کی مانگ لکھنؤ سے کی جارہی ہے اس ضمن میں ہمارا دوسرا خط بھی دیکھیں اور صورت حال کا اندازہ کریں۔

جناب ماموں صاحب السلام و علیکم

سوسائٹی کی ۳؍ تاریخ کی میٹنگ میں آنے کا ارادہ تھا۔ لیکن یہ معلوم ہوا کہ آپ اس تاریخ کو لکھنؤ آرہے ہیں۔ اس لئے ارادہ بدل دیا۔ پیاسے کے ذریعہ آپ کا ارسال کیا گیا رقعہ ملا۔ رقعہ پڑھ کر بہرائچ کے حالات اور کھاتہ داران کی بے بسی کے منظر کا نقشہ دل و دماغ میں تازہ ہوگیا۔ کروڑوں کی سوسائٹی آج دو ہزار کا قرضہ تک یک بیک دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ جہاں چالیس پچاس ہزار کا وڈرال ایک نفر کھاتہ دار کو مل جانا ایک معمولی بات تھی۔ وہاں آج پوزیشن یہ ہے کہ پانچ پانچ سو کے وڈرال کے لئے کھاتہ داران کو شام کو بلایا جاتا ہے اور یہ صورت حال عام دنوں میں ہے۔ جبکہ کسی قسم کا کوئی بحران نہیں ہے۔ بہر حال یہ سوچنے کی چیز ہے؟ .... ہم پینتیس ہزار روپیہ پیاسے کے ذریعہ بھیج رہے ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق لکھنؤ سوسائٹی کا تقریباً ساڑھے تین لاکھ روپیہ سے زائد بہرائچ سوسائٹی کو پہنچ چکا ہے.......

فقط

محمد شمیم

۳؍ نومبر ۹۱ء

مسماۃ درخشاں مہندی کو روپیہ دینے کا معاملہ

لکھنؤ مولوی گنج سوسائٹی کے چار پانچ مکانات چھوڑ کر یہ مسماۃ رہتی ہیں۔ انھیں معلوم ہوا کہ سوسائٹی کے صدر بڑے دریا دل آدمی ہیں۔ حالات خراب کتنے کیوں نہ ہوں۔ روپیہ بڑی آسانی سے دے دیتے ہیں۔ بس صرف تھوڑی سی تعریف کی ضرورت ہے۔ مسماۃ بڑی جہاں دیدہ اور سمجھ دار تھیں۔ تھوڑی بات سے بہت سمجھ گئیں۔ ماسٹر صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ حکم ہوا کہ شمیم میاں مسماۃ کو دس ہزار روپیہ دے دو۔ یہ کہہ کر ماسٹر صاحب چلے گئے۔ میں نے مسماۃ

سے بات کی اور معلومات کی۔ ان کے گھر بھی گیا۔ میری سمجھ میں بات نہیں آئی۔ میں نے روپیہ نہیں دیا۔ مسماۃ بہرائچ پہنچ گئیں اور ۱۲؍ نومبر ۱۹۹۱ء کو ماسٹر صاحب کا تحریر کردہ خط لے کر حاضر ہوئیں میں نے خط پڑھ کر رکھ لیا اور روپیہ نہ ہونے کا بہانہ کر دیا۔ مسماۃ پھر بہرائچ پہنچ گئیں اس سلسلے میں منشی ریاض اور بیالیسے کو لکھنؤ بھیجا گیا اور کہلایا گیا کہ شمیم سے کہہ دو کہ روپیہ دے دیں۔ میں نے جواب میں کہلا دیا کہ ہم روپیہ نہیں دیں گے۔ اگر ایسے ہی روپیہ بانٹنا ہے تو ہم سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ وہ مجھے دیں گے تو ہم لے لیں گے۔ ہماری یہ بات ایسے ہی جا کر ماسٹر صاحب سے کہہ دیتا۔ بہر حال ہم نے روپیہ نہیں دیا۔ جب میں نے روپیہ نہیں دیا تو مسماۃ کو بہرائچ بلا کر روپیہ دیا گیا۔ دھیان رہے ایک طرف سوسائٹی کے حالات یہ ہیں کہ لوگوں کی جمع رقم کا دینا مشکل ہو رہا ہے اور دوسری طرف ہماری شہنشاہیت کا حال یہ ہے۔

تیسرے یا چوتھے روز ندوہ میں کوئی پروگرام تھا۔ حاجی امین بیگ، ماسٹر صاحب و دیگر کچھ حضرات ندوہ آئے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے مجھ سے کہا کہ شمیم میاں ماسٹر صاحب نے مسماۃ کو روپیہ دے دیا۔ ماسٹر صاحب بھی چند قدم پر کھڑے تھے۔ میں نے کہا کہ وہ تو شہنشاہ ہیں ہم لوگ تو صرف درباری ہیں۔ وہ جو چاہیں کریں۔ یہ بات جب انھوں نے سنی تو حاجی صاحب سے کہنے لگے کہ ان کو کیوں بتا دیا۔ بہر حال روپیہ بہرائچ سے دیا گیا اور ٹرانسفر لکھنؤ سوسائٹی کو کر دیا گیا اور حکم کر دیا گیا کہ لکھنؤ سوسائٹی روپیہ وصول کرے۔ جواب تک نہ وصول ہوا ہے اور نہ وصول ہوگا۔ یہ ہے شہنشاہ ہے سوسائٹی کا کارنامہ۔ پھر کہتے ہیں کہ ــــ

"آج جب حالات خراب ہیں تو تم بھی وہی کہہ رہے ہو جو دوسرے کہہ اور کر رہے ہیں۔"

بیٹرناپور سوسائٹی کا قیام

ایک طرف سوسائٹی کا حال یہ ہے کہ غریب کھاتہ داروں کو ان کی جمع شدہ رقم ان کی ضرورت پر دینا مشکل ہو رہا ہے اور دوسری طرف ہم سوسائٹیوں پر سوسائٹیاں کھول کر ترقی کے کارنامے جگانے کا کام کر رہے ہیں اور یہ سب خودنمائی، خودپسندی اور خودسری کے جذبے میں کیا جا رہا ہے۔ ۳؍ جنوری ۱۹۹۲ء کو بیٹر ناپور سوسائٹی کا قیام اسی جذبے کے نتیجہ میں ہے۔ جس وقت بیٹرناپور سوسائٹی قائم کی گئی تھی اس وقت ماسٹر صاحب نے سوسائٹیاں کھولنے

جانے کا بھوت شدت سے سوار تھا۔ ان کی گفتگو اور ان کے طریقہ کار سے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ بہرائچ کے ہر گھر میں ایک سوسائٹی قائم کردیں۔ چند روز کے بعد سننے میں آیا کہ شہر ہی میں آدھے اور پون کلو میٹر کی دوسری پر ہی دو مزید اور سوسائٹیاں کھول دی گئیں۔ ایک روڈویز بس اسٹیشن پر اور دوسری محلہ ناظر پورہ میں۔

ملی اسپتال کا قیام

دھیان رہے ایک طرف حالات یہ ہیں کہ کھاتہ داران کو ان کا خود کا روپیہ دینا مشکل ہو رہا ہے۔ اور دوسری طرف ہم اپنی شہرت و ناموری میں سوسائٹیوں کے نہ صرف جال بچھا رہے ہیں بلکہ ملی اسپتال کے ذریعہ بھی ہم وہی کچھ چاہ رہے ہیں جو ہمارے دل میں ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر   نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

۲۶ جنوری ۹۲ء کو اسپتال کا افتتاح تو ضرور ہو گیا۔ اس افتتاحی تقریب میں بھی میں شریک تھا اور اس تقریب میں بھی شریک رہا۔ جو ملی فارم پر منعقد ہوئی جس میں حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب باندوی تشریف لائے تھے۔ میری شرکت اور موجودگی صرف صورت حال کا جائزہ لینے اور جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھنے تک ہی محدود رہی۔ باقی میری شرکت اور موجودگی کے کوئی اور معنے نہیں تھے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ ریت کے محل دسو سائٹیاں۔ اسپتال' مدرسے' اسکول، جس تیزی سے قائم کئے جارہے ہیں۔ وہ کب تک قائم رہیں گے؟۔۔۔۔ یہ سوال میرے ذہن میں بار بار ابھرتا تھا۔ حالانکہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا کوئی بری چیز نہیں تھی۔ اسپتال کے ذریعہ آنکھوں کا مفت آپریشن کیمپ لگا۔ لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچا۔ یہ ایک اچھی چیز تھی۔ لیکن جس تیز رفتاری سے اور جس جذبے ومنشاء سے یہ کیا جارہا تھا۔ اس میں ڈھنپچر نیچر نکلنا لازمی تھا۔ اور یہ جملہ میں نے اپنے ۱۷ مارچ ۹۱ء کے خط میں بھی اور اس سے قبل بھی دو خطوں میں لکھ چکا تھا۔ اور آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا ساکھ ختم ہوگئی۔ ماسٹر صاحب کی ذات کو نقصان پہنچا، وقار مجروح ہوا اور وہ تمام منصوبے بھی خاک میں مل گئے جس کے لئے اڑان بھری جارہی تھی۔

کھدرا لکھنؤ میں سوسائٹی کا قیام

سوسائٹیوں کے قیام کی جو صورت حال بہرائچ میں بنا رکھی تھی وہی لکھنؤ میں بھی جاری

تھے۔ کرامت مارکیٹ لکھنؤ کی دوکان اسی نقطۂ نظر سے لی تھی۔ لیکن میری مخالفت کی وجہ سے وہ اور زیادہ یہاں کچھ نہیں کرسکے۔ لیکن ۹۲ء میں جب تندت کا بھوت ان پر سوار تھا۔ اس وقت وہ یہاں بھی دو چار شاخیں کھولنے کا جتن کرتے۔ میں نے صورت حال کو بھانپنے کے بعد کہا۔ آپ کہیں اور نہ کھولیں کھدرا میں کھول دیں ہم دیکھ لیں گے (دھیان رہے سوسائٹی کی شاخ کھولے جانے کے سلسلے میں لکھنؤ کے دور دراز محلے کے لوگ ماسٹر صاحب سے ملنے لگے تھے) بس یہی مجبوری تھی جو کھدرا میں سوسائٹی کھلنے کا ذریعہ بنی۔

ضلع بہرائچ میں ایک موضع کی داستان غم

۲۵ مارچ ۹۲ء کو نواب نبگہ میں ایک ہی خاندان کے ۹ افراد کا جب اجتماعی قتل پولیس اور بھاجپائی لیڈروں کی ملی بھگت سے ہوا تو ماسٹر نعیم اللہ نے مقتولین ومتاثرین کو سب سے پہلے کپڑے و دوسرے چیزیں سے راحت پہنچائی (بحوالہ قومی آواز مورخہ ۲۶ مارچ ۹۲ء) اور ضلع انتظامیہ سے بھی مل کر ان کی جو مدد ہوسکتی تھی وہ کرائی۔ یہی نہیں اس کے علاوہ جب بھی ضلع وشہر میں کہیں بھی کوئی واقعہ رونما ہوا ماسٹر نعیم اللہ ہی دکھائی دیے۔ خواہ سیلاب کی صورت حال ہو۔ یا کسی گاؤں میں آگ زنی و نساد۔ ۸۳ء کا دنگا ہو یا مذہب تبدیلی کا واقعہ کہاں اور کب ماسٹر نعیم اللہ آگے نہیں رہے؟......... یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے "سوسائٹی" عوام کی آس اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔ ضلع کی سطح پر جہاں بھی چھوٹا ہو یا بڑا کوئی واقعہ رونما ہوتا لوگ سوسائٹی ہی کی طرف متوجہ ہوتے۔ کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کرسکتا ہے؟....... لیکن افسوس آج نہ وہ سوسائٹی وہ سوسائٹی رہی اور نہ ماسٹر نعیم اللہ وہ ماسٹر نعیم اللہ رہے۔ سب کچھ بگڑ گیا تو پھر؟......... کہاں آس اور کہاں امید ــ وہ بھی ختم ہوگئی۔

بنگلور کا فقہی سیمینار

یہ سیمینار غالباً ۶ جون ۹۲ء کو ہوا تھا۔ اس تاریخی سیمینار میں ملک کے تمام متحرک بلاسودی اداروں کے ذمہ داروں نے شرکت کی۔ سیمینار خاصا کامیاب رہا۔ بہرائچ سوسائٹی کی نمائندگی ماسٹر نعیم اللہ۔ سکریٹری سید وصی الدین حاجی امین بیگ، پرنسپل حمید اللہ و دیگر کچھ

لوگوں نے کی۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملی سوسائٹی کی شہرت ملکی پیمانے پر اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ بنگلور کے اس فقہی سمینار میں سوسائٹی نے اپنی کارگزاریوں و اپنے طریقہ کار کی وجہ سے دوسری تمام سوسائٹیوں کے مقابلے فوقیت حاصل کی۔

کانپور میں سوسائٹی کھولے جانے کی مخالفت

کانپور میں سوسائٹی کھولے جانے کا جب پروگرام بنا میں نے اس کی مخالفت کی پھر بھی دوکان پچاس ہزار روپیہ ایڈوانس دے کر لے لی گئی۔ لیکن اس کے باوجود ہماری مخالفت آخر تک جاری رہی۔ میں نے اس ضمن میں جو خط لکھا تھا من وعن نقل کر رہا ہوں۔

جناب ماموں صاحب السلام وعلیکم

ضروری تحریر یہ ہے کہ کانپور کی دوکان میں سٹرنگ چکا ہے۔ باہر کا فرش ہفتہ بھر میں غالباً مکمل ہو جائے گا۔ اب صرف افتتاح کا دن اور تاریخ مقرر کرنا ہے۔ اس سے قبل پھر میری آپ سے استدعا ہے کہ اس شاخ کے افتتاح سے پہلے از سر نو پھر غور فرمالیں کہ شاخ کا کھولنا کس حد تک سودمند ہوگا۔ اگر کانپور کی یہ شاخ کانپور کے ہی افراد کے ذریعہ کھولی جاتی اور ان کے ہی ذریعہ چلائی جاتی تو اس میں کوئی پریشانی اور دشواری نہیں تھی۔ لیکن بہرائچ کھول کر چلائے گا۔ کس کے ذریعہ چلائے گا اور کیا کیا اور کیسے ہوگا؟ یہ بات مجھ (احمد ہلال) کسی سمجھ میں نہیں آتی۔ لوگوں کی سوچ اور ذہنیت کا جب اندازہ ہوتا ہے ان میں چاہے عملہ کے لوگ ہوں یا سوسائٹی کے ہمدرد و بہی خواہ تو مجھے بے ساختہ یہ شعر یاد آتا ہے کہ ؎

ویران گلستاں کرنے کو بس ایک ہی الّو کافی ہے
جہاں ہر شاخ پہ الّو بیٹھے ہیں انجام گلستاں کیا ہوگا

ویسے میں آپ کے توسیع پسندانہ عزائم کی دل سے قدر کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ زیادہ کام ہو۔ لیکن سوچ وفکر میں حالات وقت اب اس کا نہیں ہے۔ اسی لئے میں آپ سے پھر گذارش کرتا ہوں کہ آپ اس بارے میں سوچ لیں اور بہتر سے بہتر میرے نظریہ سے یہی ہے کہ اس ارادے کو ملتوی کر دیں۔ میری سمجھ سے یہ ادارے کے حق میں بھی بہتر ہے اور

آپ کے ہمارے حق میں بھی۔ ایڈوانس میں دی گئی پچاس ہزار کی رقم یہ سمجھ کر واپس کر لیں کہ ہم نے کسی مسلمان کے تعمیری کام میں مدد کر دی ہے۔ میں نے اپنی ناقص رائے کا اظہار کر دیا ہے۔

فقط

محمد شمیم

۴ جولائی ۹۲ء

سفر کا انوکھا ساتھی

ماسٹر عبد القدوس[1]، سید وصی الدین[2] اور حاجی امین بیگ[3] کے بعد ماسٹر صاحب انوکھے[4] کو سفر میں ساتھ لے جانے لگے۔ ایک بار دلی، سہارنپور، دیوبند اور نہ جانے کہاں کہاں سفر کر کے لکھنؤ واپس آئے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ انوکھے کی غیر موجودگی میں۔ میں نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ حاجی امین بیگ، سید وصی الدین اور ماسٹر عبد القدوس تو آپ کے ساتھ کھپتے تھے۔ لیکن یہ شخص آپ کے ساتھ کھپتا نہیں ہے۔ آپ اس کو کہاں کہاں لئے پھرتے ہیں۔ جہاں جاتے ہوں گے وہاں بھی آپ کی وقعت گھٹتی ہوگی۔ بات کچھ ایسے موقع کی تھی کہ شاید سمجھ میں آگئی۔ پھر اس کے بعد انوکھے کے ساتھ سفر نہیں کیا۔ لیکن دوسروں کے مقابلے وہ ماسٹر صاحب کا چہیتا ضرور رہا۔ کیونکہ وہ جالا صاف کر دیا کرتا تھا۔ کہیں کوئی سامان ادھر ادھر پڑا دیکھا اٹھا کر رکھ دیا۔ کہیں گندگی دیکھی صاف کر دی۔ جہاں جھاڑو دیدیا چلا گیا۔ بس یہی معیار تھا چہیتگی کا۔ دوسرے وہ تعریف کرنے اور ہاں میں ہاں ملانے کا کام بھی کر لیا کرتا تھا۔ اس لئے وہ منظور نظر تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ مجلس منتظمہ تک میں داخل ہو گیا تھا۔ ماسٹر عبد القدوس جیسے مخلص شخص کی ۱۹۸۸ء میں بدظنی کی ایک وجہ یہ بھی رہی۔

---

[1] ماسٹر عبد القدوس ۱۹۸۸ء میں سوسائٹی سے نکال دئے گئے

[2] سکریٹری سید وصی الدین پر بقول عقیل اللہ ماسٹر صاحب کا اعتماد نہیں رہا

[3] حاجی امین بیگ اپنے نجی کاموں میں مشغول رہنے لگے

[4] غلام مصطفیٰ وارثی عرف اچھن

انوکھے کے انوکھے کارنامے پر ہمارا خط اور اس کی بے دخلی

جس واقعہ کو لے کر میں نے خط لکھا۔ اس کو گزرے آٹھ نو ماہ ہو چکے تھے۔ لیکن کوئی کاروائی معلوم ہوتے ہوئے بھی اس لئے اس کے خلاف نہیں کی گئی کہ کسی نے کوئی آواز نہیں اٹھائی میرا خط اسی ضمن میں ہے۔ جو من و عن نقل کیا جا رہا ہے۔

محترم جناب صدر صاحب السلام وعلیکم

بلاسودی اداروں میں "ملی امدادی سوسائٹی بہرائچ" کی جو شہرت بیرون اضلاع و پورے ملک میں ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اتنی بڑی سوسائٹی جس کا کروڑوں کا لین دین ہو۔ اس کی مجلس منتظمہ میں اگر ایسے عناصر جو چاپلوسی، ہاں حضوری و خدمت گاری کی کارگذاری کی جھوٹی شان کے بل پر داخل ہو جائیں۔ جنھیں نہ ادارہ کا پاس و لحاظ ہو، نہ ادارے سے متعلق دوسرے افراد کا کہ ہم کس کے ساتھ ہیں اور کہاں ہیں؟ ایسے نکمے بے ہودہ اور نیچ حرکت کرنے والے شخص کو سوسائٹی کی نہ صرف مجلس منتظمہ بلکہ مجلس عامہ سے بھی نکالا جانا چاہیئے۔ مندرجہ بالا تحریر ایک ایسے ہی شخص کے بارے میں ہے۔ جن سے متعلق ایک ایسی شکایت مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوئی ہے۔ جو شرمناک ہے۔ واقعہ یوں ہے ــــ "سوسائٹی کا ایک وفد تقریباً آٹھ نو ماہ قبل بہرائچ کسی علاقہ میں بذریعہ جیپ گیا ہوا تھا۔ اس وفد میں سوسائٹی کے صدر کے علاوہ دیگر اور اراکین بھی شامل تھے۔ اتفاقاً واپسی میں کچھ حالات کے تحت تھوڑی دیر کے لئے کسی گاؤں میں ایک شخص کے مکان کے سائبان میں وفد کو رکنا پڑا۔ گھر کے مالک کے چھپر سے میں کوئی بے قیمت یا قیمتی چادر لگی ہوئی تھی منتظمہ کے اس شخص نے وہ چادر نکال کر اپنے پاس رکھ لی۔ گھر کی مالکن نے کسی پوشیدہ جگہ سے اتفاق سے چادر نکالتے ہوئے دیکھ لیا۔ جب وفد کے سارے لوگ جیپ میں بیٹھ گئے تو ایک شخص عورت کے کہنے پر چادر مانگنے جیپ پر آیا اور کہنے لگا کہ ایک صاحب چادر لے آئے ہیں۔ مگر چونکہ چادر چھپائی جا چکی تھی اس لئے چادر نہیں دی گئی۔ وہ آدمی عورت کے کہنے پر پھر دوبارہ چادر کے لئے آیا۔ مگر چادر اس کو نہیں مل سکی۔ وفد میں شامل دو ایک لوگوں کو اس کا علم تھا۔ مگر

صدر صاحب سے اس شخص کی قربت شاید لوگوں کے منہ پر تالا لگا گئی اور کسی نے اس کی اس اوچھی حرکت پر زبان نہیں کھولی۔

لہذا اس واقعہ کی تحقیق کرائی جانی چاہیئے۔ واقعہ کے صحیح ثابت ہونے پر اس شخص کو سوسائٹی کی رکنیت سے خارج کیا جائے۔ ایسی میری تجویز ہے۔

فقط

محمد شمیم بہرائچی

رکن مجلس عاملہ ملی سوسائٹی بہرائچ

۲۲ جولائی ۹۲ء

دھیان رہے یہی وہ انوکھا تھا جس کی خاطر ماسٹر عبدالقدوس جیسے مخلص شخص کی بے وقعتی شروع ہوئی۔ اسی انوکھے کی رائے پر جنرل سوسائٹی بس زیور یہاں رکھنے اور وہاں رکھنے کے معاملے نے وصی اور ماسٹر صاحب کے بیچ تلخی پیدا کی یہی انوکھا سید وصی الدین کی ہر بات کا مذاق اڑاتا تھا۔ اور یہی وہ انوکھا تھا جس نے لکھنؤ میں مجھے بھی چیلنج کیا تھا کہ ہم تم کو سمجھیں گے۔

بہر حال چوری کے اس واقعہ سے ماسٹر صاحب بھی ناراض رہنے لگے تھے۔ بالآخر ہمالے خط کے ضمن میں ہی اسے سوسائٹی سے نکالا گیا۔

کانپور سوسائٹی آخر کھل ہی گئی

کانپور سوسائٹی کے افتتاح کے دن ماسٹر صاحب بذریعہ بس قافلہ لے کر لکھنؤ آئے مجھ سے کہنے لگے کانپور چلو گے۔ میں نے کہا کہ چلنے میں کیا ہے ہم بھی تماشائی کی حیثیت سے چلے چلیں گے۔ اتنے میں حاجی امین بیگ نے میرے بھیجے گئے خط کے ضمن میں کہا کہ تم نے تو مجھے بھی الو بنا دیا ہے۔ میں نے کہا کہ تم ہی کیوں الو ہو۔ میں بھی ان الوؤں میں سے ایک الو ہوں۔ کیونکہ میں بھی ایک ریاستؔ کا منیجر ہوں۔ بہر حال ۸ ر اگست ۹۲ء کو کانپور میں

ؔ سوسائٹی

سوسائٹی کھول دی گئی جس کا افتتاح بزرگ عالم دین حضرت مولانا محمد قاری صدیق صاحب نے کیا۔

ماسٹر صاحب کی خود اعتمادی یا خود سری

ایک صاحب نے کہا کہ کام کرتے کرتے ماسٹر صاحب میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی ہے۔ لکھنؤ سوسائٹی کا قیام اور اب کانپور سوسائٹی اسی خود اعتمادی کی دلیل ہے۔ میں نے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن جب خود اعتمادی ہو تب تو۔ میرے اس جواب پر وہ تھوڑا چونکے۔ کہنے لگے تو پھر کیا ہے؟ .... میں نے کہا کہ دیکھئے انسانی اوصاف میں خود اعتمادی ایک اعلیٰ صفت ہے۔ لیکن جب وہ خود پسندی، خود آرائی اور خود سری تک پہنچ جائے۔ تو وہ صفت نہیں مرض بن جاتا ہے۔ ماسٹر نعیم اللہ آج اسی مرض میں گرفتار ہیں۔ انھوں نے سنہ ۸۶ء و سنہ ۸۷ء تک جو بھی کام کئے وہ تو خود اعتمادی کی تعریف میں آتے تھے۔ اور اسی لئے ضلع و شہری سطح پر لوگ ان کے اقدامات کو سراہتے تھے۔ لیکن افسوس کہ وہ اس مقبولیت و تعریف کو ہضم نہ کر سکے اور رفتہ رفتہ وہ خود پسندی اور خود سری کے مرض میں گرفتار ہوتے چلے گئے اور چلے جا رہے ہیں۔ ان کی اس روش کے خطرناک نتائج آپ بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے جو لوگ ان کی بہی خواہی کا دم بھرتے ہیں انھیں چاہیئے کہ وہ سخت ہو جائیں۔ یہی ماسٹر نعیم اللہ کے ساتھ خیر خواہی ہے۔ روپیہ دینے میں بھی سخت ہو جائیں۔ نہیں تو بہت جلد پچھتانا اور رونا ہوگا۔ غرض اس طرح کی گفتگو بارش ہونے کے سبب کانپور کی ایک مسجد میں میری لوگوں سے ہوئی۔ اس گفتگو میں مجھے یاد نہیں کون کون لوگ تھے۔ صرف اتنا یاد ہے بہرائچ سوسائٹی کی مجلس عاملہ کے رکن مسٹر اکرام الدین وجرول کے ذمہ دار وصی احمد و ان کے خزانچی ضرور[۱] تھے۔

ماسٹر صاحب کی بیماری

سوسائٹی کی پوزیشن جتنی اچھی سنہ ۸۸ء سے پہلے تھی۔ اتنی اچھی کبھی نہیں رہی۔ غالباً

---

۱ تصدیق کے لئے ان حضرات سے پوچھا جا سکتا ہے۔

اکتوبر یا نومبر ۹۰ء سے سوسائٹی اتار چڑھاؤ کی طرف گامزن ہونا شروع ہوگئی۔ لیکن ہماری بے ڈھنگی روش اور ہمارے فکر و عمل میں کسی طرح کی نرمی کے بجائے شدت پر شدت ہی پیدا ہوتی رہی۔ اس طرح دھیرے دھیرے سوسائٹی کی پوزیشن بگڑتی رہی۔ اسی درمیان ماسٹر صاحب ایک لمبی بیماری کا شکار ہو گئے۔ اب سوسائٹی کے نام نہاد مالک و مختار و صدر جناب عقیل اللہ شاہد ندوی تھے۔ وہ کافی خوش تھے کہ ہم سوسائٹی چلا رہے ہیں۔ میں جب جب بھی بیماری کی حالت میں ماسٹر صاحب کو دیکھنے گیا۔ میں نے سوسائٹی کی آمد و واپسی پر گہرائی سے نظر ڈالی۔ تو مجھ کو ایسا محسوس ہوا کہ سوسائٹی بہت جلد بحران کا شکار ہو جائے گی۔ اول سب سے پہلے تو ہم نے تعمیری کام کو رکوا دیا۔ پھر عقیل اللہ سے بات کی انھوں نے کہا کہ سب ٹھیک چل رہا ہے۔ میں نے بیس ہزار وہاں سے لاکر دیا۔ دس ہزار وہاں سے لایا۔ اور پندرہ ہزار ان سے لیا غرض اس طرح کی باتیں بتا کر وہ اپنی کارگزاری بتا کر اسی میں خوش تھے کہ ہم سوسائٹی چلا لے گئے۔ میں بات کو سنتا رہا خاموش رہا۔ کہتا بھی کیا اور کس سے کہتا؟......من میں سوچتا رہا کہ اگر ایسے ہی سوسائٹی چلنا ہوتی تو ہر جگہ چل جاتی۔ دوبارہ دس دن کے بعد جب میرا پھر جانا ہوا۔ تو میں نے دیکھا کہ سوسائٹی کی پوزیشن اور زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ میں نے عقیل اللہ سے کہا کہ ایسا ہے کہ وصی صاحب کو بلوائیے۔ صرف اتنا ہی کہا تھا مزید اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جواب ملا۔ بابو کو ان پر اعتماد نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ ماسٹر صاحب کی حالت اتنی خراب ہے۔ اگر ان پر اعتماد نہیں تو کس پر اعتماد ہے؟ اس کو بلاؤ۔ سوسائٹی ایسے نہیں چل پائے گی جیسا تم چلا رہے ہو۔ دو روز کے بعد جب ماسٹر صاحب کی طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی تو میری بے چینی کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ میں من میں سوچنے لگا کہ ماسٹر صاحب نے کام اتنا پھیلا دیا ہے کہ اگر خدانخواستہ کہیں ماسٹر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تو پھر اس پھیلاؤ کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے پہلے سے ہی کوئی شکل بنی چاہیئے۔ اس سلسلے میں ہم نے منشی جی (قمر الدین صدیقی ایڈووکیٹ) سے بات کی۔ مشورہ کرنے کے بعد ہم دونوں پرنسپل حمید اللہ صاحب کے پاس گئے۔ بات پوری کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ مجھ پر برسنے لگے۔ اور غصہ میں بہت کچھ کہہ ڈالا جب غصہ

کچھ ٹھنڈا ہوا پھر میں نے اپنی بات یہ کہہ کر دہرائی کہ ماموں ایسا نہیں ہے۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ عارضی طور پر جب تک ماسٹر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو رہی ہے کسی کو ذمہ دار بنا دیا جائے۔ سوسائٹی کی پوزیشن بہت خراب ہو رہی ہے اور اگر یہی صورت حال رہی تو پھر سنبھالے بھی سنبھل نہیں سکے گی۔ ایسی صورت میں سوسائٹی کے جو جال پھیلائے گئے ہیں۔ ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا کچھ سوچیے اور کچھ کریے پھر وہ کسی طرح راضی ہوئے۔ اور ہم لوگوں کے ساتھ سوسائٹی آئے۔ منیجر زاہد علی کو بلوایا۔ ان سے سوسائٹی کی صورت حال دریافت کی۔ پھر ہم ہی لوگوں کے مشورہ سے انھوں نے زاہد علی سے کہا کہ قرض تو بالکل بند ہی ہے اب جو لوگ قرض کی مدت بڑھانے آئیں ان سے ہر حال میں روپیہ جمع کرنے کی بات کہو۔ اگر وہ ایسا نہ کر پائیں تو انھیں کچھ جمع کرنے پر راضی کرو۔ پھر بحالت مجبوری ان کے قرض کی مدت بڑھاؤ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ حوصلہ اور ہمت سے کام لو روپیہ دیا جائے گا۔ بس صرف اتنی بات پرنسپل صاحب نے کہی۔ دو تین روز کے بعد ماسٹر صاحب کی طبیعت قدرے بہتر ہو گئی۔ اور ہفتہ بھر میں کافی اچھی ہو گئی۔ ماسٹر صاحب سوسائٹی آئے تو انھوں نے غالباً سب سے پہلی تلوار پرنسپل صاحب کے زبانی دئے گئے مشورہ پر یہ کہہ کر چلا دی کہ کون ہوتا ہے جو میری غیر موجودگی میں کوئی حکم کرے۔ غالباً اس طرح کی بات تحریر میں یا زبانی زاہد علی سے کہی گئی۔ زاہد علی نے یہ بات پرنسپل صاحب کو بتائی تو پرنسپل صاحب کو ماسٹر صاحب کے اس اقدام سے کافی دکھ ہوا۔ ملاقات ہونے پر انھوں نے تذکرہ کیا اور مجھ پر خفگی کا اظہار کیا کہ تمھاری وجہ سے ہی میں گیا تھا۔ ورنہ مجھے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے صورت حال کو واضح کرتے ہوئے ماسٹر صاحب سے کہا کہ آپ کا یہ اقدام قطعاً صحیح نہیں رہا جواب میں کہنے لگے کہ میرے اس اقدام سے ان کو بڑا دکھ پہنچا۔ لیکن فلاں ایڈمیشن کے بارے میں ہم نے یہ کہا ہم نے وہ کہا۔ تب مجھے دکھ نہیں پہنچا۔ غرض کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ماسٹر صاحب نے کبھی بھی سیدھے سیدھے اپنی غلطی تسلیم نہیں کی۔ الٹے اپنے ہر اقدام کو صحیح ٹھہرانے کے لئے تاویلوں کا سہارا لیتے رہے۔

بیماری کے بعد ماسٹر صاحب کا سفر باندہ و خواب کا تذکرہ

اس سفر میں ماسٹر صاحب کے ساتھ حاجی امین بیگ۔ صوفی معین الدین یعنی صوفی صاحب اور دو حضرات کے علاوہ میں بھی تھا۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد تھوڑے دیر کے لئے ہم سبھی لوگ ماسٹر صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کچھ اور باتیں ہوتی رہی اس کے بعد ماسٹر صاحب نے اپنا خواب بیان کیا اور اپنی من مرضی مطابق اس کی تعبیر بھی نکال لی۔ تذکرہ یوں تھا کہ ماسٹر صاحب سیلاب میں گھر گئے ہیں۔ بہت کوشش کر رہے ہیں لیکن نکل نہیں پا رہے ہیں کہ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ سیلاب کے ساتھ نیلا ہی میلا یعنی گندگی ہی گندگی آرہی ہے۔ اور اب ہم اس میں گھر گئے۔ بہت کوشش کرنے کے بعد ہم کسی طرح نکل سکے۔ غرض خواب کا لب لباب کچھ ایسا ہی تھا خواب کو سننے کے بعد ہم لوگ اپنی اپنی جگہ پر جاکر مسجد میں سو گئے۔ قاری صاحب کی مسجد میں چونکہ اول وقت نماز فجر ہوتی ہے۔ فجر نماز ادا کرنے کے بعد میں پھر سو گیا دیکھتا کیا ہوں کہ کوئی میرے کانوں میں دستک دے رہا ہے کہ "ماسٹر نعیم اللہ نے اگر اپنی اصلاح نہیں کی تو بزرگوں کی دعائیں بھی انھیں بچا نہیں سکیں گی" اتنا سننا تھا کہ میں کھڑبڑا کر اٹھ پڑا۔ میں نے اس واقعہ کا تذکرہ اسی وقت حاجی امین بیگ اور صوفی صاحب سے کیا۔ اور کہہ دیا کہ خواب ماسٹر صاحب سے بتا دینا اور کہہ دینا کہ ابھی کچھ بگڑا نہیں ہے۔ اپنے کو سنبھال لیں۔ تصدیق کے لئے ان دونوں حضرات سے آج بھی پوچھا جا سکتا ہے۔

ایک اہم خط پھر ماموں جان کے نام

میں پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ سوسائٹی کی صورت حال کافی پہلے سے خراب چل رہی تھی اور بیماری کے بعد اور زیادہ خراب ہوئی۔ صحت یابی مل جانے کے بعد بھی ہمارے تیوروں میں اور ہمارے طریقہ میں کوئی ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی۔ خرچ کا وہی انداز، بڑھک مارنے والی وہی باتیں۔ غرور اور گھمنڈ کا وہی نشہ اب بھی برقرار ہے۔ سوسائٹی کی حالت خراب ہے۔ روپیہ کے لئے وڈیرال لکھنؤ بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے سخت رخ اختیار کرتے ہوئے۔ ایک مزید اور خط اپنے ماموں جان کو لکھا — یہ خط ہم نے

بابو فیض الحسنؒ کے ہاتھوں بھیجا تھا۔ جو من وعن نقل کر رہا ہوں۔

جناب ماموں صاحب اسلام وعلیکم

آپ کی خیریت کی اطلاع برابر ملتی رہی۔ امید ہے کہ اب طبیعت بالکل ٹھیک ہوگی۔ سید راشد حسن صاحب نے جوائن تو کر لیا تھا لیکن ایک ہفتہ کے بعد ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ جس کی وجہ سے وہ سوسائٹی نہیں آرہے ہیں۔ میں دوبار ان کی عیادت کے لئے گیا بھی۔ امید ہے کہ دو تین دن میں وہ انشاء اللہ جوائن کر لیں گے۔ ان کے آنے سے سوسائٹی کے حسابات کے چیکنگ صحیح ڈھنگ سے ہو جائے گی۔ بہرائچ سے تین ہزار کے ڈرال کے بعد لمبا ہزار کا ڈرال جو بھیجا گیا اسے میں نے کر دیا ہے۔ لیکن براہ کرم یہاں پر کسی قسم کا کوئی ڈرال بھیجنے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ یہاں بھی کوئی اچھے حالات نہیں ہیں اور اگر یہاں بھی بہرائچ کی سی صورت حال پیدا کرنی مقصود ہے تو پھر ڈرال پر ڈرال بھیجتے چلے جائیں۔ ہم بہرائچ کے ڈرال کرنے کے بعد لکھنؤ میں تالا لگوا دیں گے۔ ہم بارہا ان خطرات سے آپ کو آگاہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن آپ نے ذرا دیر کے لئے بھی سوچنا گوارا نہیں کیا۔ بالآخر مجبور ہوکر ۱۷ مارچ ۱۹۸۰ء کو ایک لمبا چوڑا خط آپ کی خدمت میں تحریر کیا تھا جو تلخ ضرور تھا۔ لیکن نیک نیتی، اخلاص اور خلوص کے جذبے کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ مگر افسوس کہ آپ نے اسے غور کرنے کے قابل تک نہ سمجھا۔ الٹے اس کے جواب میں آپ کا وہ بھیجا ہوا خط بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ جس میں آپ نے لکھا تھا کہ یہ سب بزدلی کی باتیں ہیں۔

حالانکہ اس جواب کے بعد مجھے بالکل خاموش ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ماموں بھانجے استاد و شاگرد کا یہ مضبوط رشتہ مجھے اپنا فرض ادا کرنے کے لئے کچوٹتا رہا اور دوسری طرف سوسائٹی کے ایک معمولی رکن کے ناطے بھی۔ یہی وہ مجبوری تھی جس نے مجھے ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو پھر دوبارہ خط لکھنے پر مجبور کر دیا جس کا کچھ اقتباس اسی خط میں نقل کر رہا ہوں۔ اور ۱۷ مارچ ۱۹۸۰ء کے خط کی فوٹو کاپی بھی اسی کے ساتھ منسلک ہے۔

ف ۵ آزاد کالج میں ٹیچر ہوگئے اور سوسائٹی کی مجلس عامہ کے رکن ہیں۔

" اس صورت حال پر سوسائٹی کو چلانا کوئی اچھی چیز نہیں ہے اور نہ اس صورت حال کو پیدا کر کے ترقی کے کارنامے گنانا کوئی بڑی چیز ہے۔ ۸۳ء کے بحران سے لے کر آج تک کے بحران ہماری نظر کے سامنے ہیں......... ہم نے ترقی کتنی ہی کیوں نہ کر لی ہو لیکن آج بھی ہم بھکاری ہی ہیں۔ معمولی سے بحران کو بھی ہماری سمجھ سے ادارہ بغیر بھیک مانگے جھیل نہیں سکتا۔ اور اب تو حالات ایسے بنتے جا رہے ہیں کہ اپنے ہی اب مدد کرنے کو تیار نہیں ہیں کتنے ایسے ہیں جو آپ کے سامنے کچھ اور آپ کے پیٹھ پیچھے کچھ کہتے ہیں...... مزید وضاحت سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ اب حالات اور وقت کی نزاکت پر نگاہ رکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ رقم کو اتنا پس انداز کر کے چلیں کہ ہم کو معمولی بحران میں بھیک مانگنے کی نوبت نہ پڑے لیکن ابھی بھی اگر ہم نے نہیں سوچا تو ہماری یہ بے احتیاطی ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دے گی۔ یہ سوچنے کی چیزیں ہیں۔ اس وقت کے حالات اور آج کے حالات میں بہت فرق ہو چکا ہے۔ اس وقت جس طریقہ سے آپ چل رہے ہیں وہ طریقہ میری اپنی رائے میں اب بالکل غلط ہے... بالکل غلط ہے بالکل غلط ہے۔ خدا واسطے اس پر غور کریں۔ میں نہ بزدل ہوں نہ کم ہمت ہاں کمزور ضرور ہوں۔ یہی میری آپ سے گذارش ہے۔ اگر آپ میری اس رائے کو بزدلی پر محمول کرتے ہیں تو ہمیں اپنی اس بزدلی پر ناز ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب بھی لکھ رہا ہوں اور آئندہ بھی لکھتا رہوں گا۔"

میں نے جس خط کا یہ اقتباس نقل کیا وہ ایک سال پہلے کا ہے۔ اور دوسرا خط جس کی فوٹو کاپی خط میں منسلک ہے وہ پونے دو سال قبل کا ہے۔ حالانکہ اس وقت جو صورت حال چل رہی ہے اس میں اس طرح کی باتوں کا لکھنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن جان اور سمجھ بوجھ کر لکھ رہا ہوں کہ جب حالات معتدل تھے۔ تب بھی آپ نے کوئی احساس نہیں کیا اور آج تو حالات خراب ہیں۔ ہمارا اس وقت خط لکھنے کا صرف دو مقصد ہے یا تو آپ ضد اور چڑھ کر اپنے ہاتھوں اسے برباد کریں گے یا اسے سنوارنے اور بچانے کی کوشش کریں گے۔ اور ان میں سے جو بھی کچھ ہو گا۔ دونوں

میں خوشی ہو گی اب ہماری منشاء صرف یہی ہے صاحبزادگان[1] کے طرزِ عمل سے اور طرزِ گفتگو سے کون نالاں نہیں ہے۔ ہر کس و ناکس خواہ اپنے ہوں یا پرائے۔ جو چند پتنگے آپ کے گرد منڈلاتے نظر آتے ہیں وہ بھی خوش نہیں ہیں اور بہت سے معاملوں میں آپ کی ان دیکھی اور سرد مہری لوگوں کی آپ سے دوری کا سبب بنتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سامنے کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ کا طرزِ عمل لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ کوئی اپنے اندر یہ اخلاقی جرأت نہیں جٹا پاتا یا کسی مصلحت کی وجہ سے کچھ کہنے سے آپ کے سامنے گریز کرتا ہے۔ میں سوسائٹی سے منسلک رہوں یا نہ رہوں مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن میں اپنا فرض نبھانے سے چشم پوشی کروں اس کی پرواہ مجھے ضرور ہے۔ اور یہ میرا حق ہے۔ انسانی رشتوں کے ناطے۔ بھانجے کی حیثیت سے شاگرد کی حیثیت سے اور ایک سوسائٹی کے مخلص کارکن کی حیثیت سے بھی۔ بات تکلیف دہ ضرور ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ تکلیف مجھے بھی ہے اور یہی وجہ تھی ۱۸ رمئی ۱۹ء کو آپ کو بھیجے گئے خط میں یہ جملہ تحریر کر دیا تھا کہ — " میں نے یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ میں سوسائٹی کی ذمہ داری سے کنارہ کشی اختیار کر لوں اور یہ فیصلہ بہت سوچ و چار کے بعد کیا ہے۔ لہٰذا آپ جسے کہیں میں اس کو زیورات وغیرہ کا حساب دے کر اپنے کو اس جنجال سے چھڑا لوں " ...... اور یہ انداز اس لئے اختیار کیا تھا کہ شاید آپ اپنے میں کچھ تبدیلی پیدا کریں۔ لیکن افسوس کہ سب بکواس ثابت ہوا۔ کانپور سوسائٹی کے قیام کے سلسلے میں افتتاح کی تاریخ مقرر ہونے سے پہلے تک میں اپنی رائے اور اس کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہوئے مقررارادہ کو ملتوی کرنے کی بات کرتے رہے۔ لیکن جب دل کے دریچوں میں خلوص کم اور

---

[1] ان میں سے ایک صاحبزادے کی عقل و فہم حسنِ تدبر، سوجھ بوجھ کو بڑے بڑے لوگ نہیں پہنچ سکتے۔ ماسٹر شمیم جیسے کی کیا بساط ؟ ...... ان کی عقل و فہم سوجھ بوجھ کا پاسنگ بھی تو نہیں۔ بڑا ہو یا چھوٹا جو نگاہ سے اتر گیا یا جو نگاہ پر چڑھ گیا۔ اس کے ادب و لحاظ، پیار و محبت کا جو طریقہ و سلیقہ انداز گفتگو کا وہ لب و لہجہ جو انھیں ملا ہوا ہے اچھے اچھوں کو نصیب نہیں ہے۔ قابلیت کا جو بخار ان کو ہے۔ وہ بڑے سے لوگوں میں ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔

ناموری و ترقی جگانے کا جذبہ کارفرما ہو۔ تو بھلا پھر وہ کہاں رک سکتا ہے۔ آج کا نیوز سوسائٹی کس مرحلے میں ہے کس کو کیا پتا۔ ایم آئی بلڈرس کو بیس ہزار روپے دینے کا معاملہ ہو یا مساۃ درخشاں مہندی کے دس ہزار روپے دینے کا معاملہ ہو۔ دونوں معاملے اس طرح لٹکے پڑے ہیں کہ روپیہ کا واپس ہونا ہی مشکل نظر آرہا ہے۔ ۱۷ مارچ ۱۹۹۱ء کے خط میں ہم نے واضح طور پر لکھا تھا کہ ــــ "لکھنؤ سوسائٹی کے قیام اور بلڈنگ خریداری کے بعد سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سوسائٹی اب اپنے مقصد سے بالکل ہٹتی نظر آرہی ہے۔ اس مقصد میں کیا جذبہ اور کیا غرض کارفرما ہے۔۔۔۔۔ یہ فکرمندی اور سوچنے کی بات ہے"۔ اسی خط میں یہ جملہ بھی ایک جگہ تحریر کیا تھا کہ ــــ آج ہماری سوسائٹی کا مقصد ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بجائے کچھ اور ہو گیا ہے"۔ پھر اسی خط میں ایک چند لائن کا پیراگراف یہ بھی تھا کہ۔

" اگر یہی خیال غالب ہے اور اسی خیال کے ناطے سوسائٹیوں کے جال بچھائے جارہے ہیں اور انھیں سمیٹ کر اور سنوار کر رکھنے اور بچانے کا خیال پس پشت پڑ گیا ہے تو یہ بانسری ہو سکتا ہے کہ آپ کی زندگی تک ضرور آواز دیتی رہے۔ لیکن آپ کے بعد یہ بانسری بج نہیں سکے گی اور تاریخ جہاں اس کے بنانے سنوارنے میں آپ کا نام لے گی وہیں اس کے زوال کے اسباب پیدا کرنے میں آپ کو فراموش بھی نہیں کر سکے گی۔ وہی سپہ سالار دانش مند ہے جو اپنے فوجیوں اور سپاہیوں پر نظر رکھ کر آگے بڑھے۔ خدارا اب بھی کچھ گیا نہیں ہے آپ نے مجھے بھی اس دولت کے ڈھیر پر بٹھال کر آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے"۔

پہلے تو یہ کہا جاتا تھا کہ دشمنوں نے یہ بحران پیدا کر دیا۔ اب یہ بحران کس کا پیدا کردہ ہے۔ جہاں کھاتہ داران کو ایک سو روپیہ اور دو سو روپیہ کے لئے کئی کئی وقت دوڑنا پڑ رہا ہو۔ یہ صورت حال صدر آفس کی ہے۔ برانچوں کا تو حال کہیں زیادہ ابتر ہوگا۔ ہم جن کے سہارے ترقی کی راہ پر گامزن تھے ہم نے انھیں پیرو پر کلہاڑی مارنی شروع کر دی۔ اور ان کھاتہ داران کی ضرورتوں تک کا بھی خیال نہیں کیا۔ جس برانچ کا جو روپیہ آیا اسے تک بھی ہم نے رکنے نہیں دیا۔ صرف اس خیال سے کہ فرعونیت پیدا ہو جائے گی۔ جب ہیڈ آفس کا یہ حال ہے کہ وہ خود بھکاری ہے

تو میری وہ کیا مدد کرے گا؟..... لہذا یہاں کوئی وڈرال بھیجنے کی کوشش نہ کریں۔ روپیہ ہونے کے بعد بھی ہم ایک دمڑی بھی وہاں جانے نہیں دیں گے۔ یوں تو یہ ہی نہیں اور اگر ہوتا تو یہی ہمارا طریقہ کار ہوتا۔ اور اگر آگیا تو انشاء اللہ رہے گا۔ بس روپیہ رہے جانے کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مجھے سوسائٹی کی دیکھ بھال سے اور یہاں کے رکھ رکھاؤ سے الگ کر دیا جائے اور یا اپنے طریقہ کار کی اصلاح کر لیں۔ بس یہی میری آپ سے گذارش ہے۔ اور آخر میں ـــــ میں پھر اس جملے کو دوہرانا چاہوں گا۔ کہ ـــــ میں سوسائٹی سے منسلک رہوں یا نہ رہوں مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن میں اپنا فرض نبھانے سے چشم پوشی کروں اس کی پرواہ مجھے ضرور ہے۔ اور یہ تلخی بھرا خط اسی کا پیش خیمہ ہے۔ یہ ہمارے ضمیر کی آواز ہے دل کی آواز ہے۔ اس میں محبت کے جذبات ہیں یا دشمنی کے یہ آپ کے جانچنے کی چیز ہے۔

فقط والسلام

محمد شمیم

۱۰ نومبر ۹۲ء

بہرائچ مسلم فنڈ کا قیام

بہرائچ میں مسلم فنڈ کے قیام کی اصل غرض وغایت ماسٹر نعیم اللہ وان کے صاجزادگان کو زیر اور صرف نیچا دکھانے و کمزور کرنے کے لئے کی گئی۔ اور یہ صورت حال ہماری خود کی اپنی پیدا کردہ تھی۔ کیونکہ ہمارے ہر کام کے پیچھے مخالفین وحاسدین کو چڑھانے وجلانے کا بھی جذبہ کارفرما رہا۔ بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے و نیچا دکھانے میں صاحب زادگان نے جو طرز عمل اختیار کیا۔ وہی اس کے قیام کا محرک بنا۔ مسلم فنڈ کے ذمہ داروں سے جب میں نے اس وقت بات کی تو ان کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ صحیح ہو جائیں تو پھر مسلم فنڈ کی ضرورت ہی کیا ؟

میرا ایک جذباتی اور غلط فیصلہ

۱۰ نومبر ۹۲ء کو لکھے گئے خط کے بعد میں نے ماسٹر صاحب کی روش سے نیو ہوکر

۳ر دسمبر ۹۲ء کو ایک اخباری بیان تیار کیا۔ اور اس کو پریس کو دینا چاہتا تھا کہ ہمارے دوست مسٹر شمس الحسن و ہمارے بزرگ بابو برکت علی نے ہمارے اس جذباتی و غلط قدم سے ہم کو روکا بیان کا خاص متن صرف اتنا تھا کہ۔ "ملی امدادی سوسائٹی کے صدر ماسٹر نعیم اللہ نے لکھنؤ سوسائٹی کے منیجر مسٹر شمیم بہرائچی کو سوسائٹی کے کاموں سے بے دخل کر دیا ہے لہٰذا کوئی صاحب ان سے کسی قسم کا کوئی لین دین نہیں کریں گے۔" اس فیصلہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ تو پیچھا چھوڑیں گے نہیں ہم ہی اپنی بدنامی خود مول لے کر کسی طرح ان سے پیچھا چھڑا لیں۔ بہر حال میری منشاء پوری نہیں ہوئی۔ اور معاملہ یوں ہی چلتا رہا۔ اور بہرائچ سوسائٹی کی پوزیشن خراب در خراب ہوتی رہی لیکن ہماری شہنشاہیت اور ہمارے تیوروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

آل انڈیا ملی کونسل کا دفتر لکھنؤ ملی لاج میں

۱۳ر مئی ۹۳ء کو ماسٹر صاحب کا خط آیا کہ۔ "ملی کونسل کو عارضی طور پر صرف تین ماہ کے لئے دفتر کے واسطے پہلی منزل لاج کا بڑا کمرہ دے دیں اور ضرورت کی جو بھی چیزیں مہیا ہو سکیں وہ دے دیں یہ کام قوم و ملت دونوں کے مفاد میں ہے۔" خط کے بعد "ملی کونسل" کو دفتر کے لئے جگہ دے دی گئی۔ دفتر قائم ہو گیا۔ طارق شفیق جیسے غیر سنجیدہ لڑکے کو اس کا کنوینر بنا دیا گیا۔ جس کا حال یہ تھا کہ وہ مولانا مجاہد اسلام قاسمی و مولانا مجیب اللہ ندوی تک پر تنقیدی جملے کستا تھا۔ ایک بار تو اس نے یہ تک کہہ دیا کہ یہ بڈھے سڈھے کیا تنظیم چلائیں گے۔ میں من میں سوچنے لگا کہ یہ لڑکا۔ کس طرح بات کر رہا ہے۔ کتنے سیدھے ہیں ہمارے بزرگ جو اسے کنوینر بنا گئے۔ بہر حال کونسل کا دفتر تو کھل گیا لیکن کارگزاری صفر ہی رہی۔

سوسائٹی کے حالات کا بگڑنا اور روپیہ کے لئے جگہ جگہ مایوس دوڑ

ستمبر یا اکتوبر ۹۳ء میں پھر بہرائچ سوسائٹی کی پوزیشن کافی خراب ہو گئی۔ چھوٹے چھوٹے وڈرال بھی دینا مشکل ہو گیا۔ اسی پریشانی میں ماسٹر صاحب و حاجی امین بیگ نے دیوبند، سہارنپور، نجیب آباد، دہلی اور نہ جانے کہاں کہاں روپیہ کے لئے دوڑ لگائی۔ لیکن

کہیں سے بھی کوئی امید جب نظر نہیں آئی۔ تو حضرت مولانا اسعد صاحب کے پاس بھی پہنچے اور ان سے مدد کی اپیل کی۔ انھوں نے ایک پرچہ "مسلم فنڈ دیوبند کے منیجر مسٹر حسیب صدیقی کو لکھ دیا خوش تھے کہ اب کچھ مدد مل جائیں گی۔ انھوں نے پرچہ دیکھنے کے بعد ضابطہ کی بات کہہ دی کہ آپ اپنے یہاں کا زیور لاکر جمع کر دیں۔ اور اسی حساب سے روپیہ لے جائیں......

اس جواب سے آس اور امید کے وہ طوطے بھی اڑ گئے۔ اور خالی خالی پھر ایچ لوٹ آئے صورت حال اور مجبوری نے زیورات کی گٹھری بندھوائی۔ بات پکی کرنے کے لئے احاطہ شوکت علی لکھنؤ میں حاجی امین بیگ اور ماسٹر صاحب رات دس بجے مولانا اسعد صاحب سے ملنے آئے کیونکہ مولانا محرم کے پندرہ روزہ جلسے میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ کیا بات ہوئی کیا نہیں یہ مجھے تو معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہوا کہ زیورات لے کر دیوبند جائیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ اقدام اور زیادہ خطرناک ہے۔ راستہ میں کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا؟.... اور اگر بالغرض کچھ نہ ہوا اور روپیہ مل بھی گیا۔ تو جس قرض دار کی ادائیگی ہوگی اس کو زیورات دینے کے لئے کیا اور کتنی پریشانیاں ہوں گی پھر حالات اور زیادہ خراب ہوں گے۔ یہ بھی کچھ سوچا ہے کہ صرف گٹھری باندھ کر زیورات لے جانا ہی سوچا ہے۔ بہر حال کیا ہوا اور کیسے ہوا کہ ارادہ ملتوی ہو گیا یا مولانا کی طرف سے جھنڈی نہیں ملی۔

زیورات رکھ کر مہاجن سے قرض لینا

جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو سننے میں آیا کہ عقیل اللہ نے دور کی کوڑی سجھائی کہ زیورات رکھ مہاجن سے قرض حاصل کیا جائے۔ نتیجہ یہ کہ پھر اس پر خاموشی سے عمل ہوا۔ لیکن وہ راز راز نہ رہ سکا۔ عوام میں اور بدگمانی بڑھی جس کے نتیجہ میں روپیہ کی مانگ کے ساتھ ساتھ زیورات واپسی کی مانگ بھی بڑھنے لگی۔ اس صورت حال نے اور زیادہ پریشانی پیدا کر دی۔ اور زیورات کا چھڑانا ضروری ہو گیا۔ جہاں میں نے روپیہ نہ دینے کی ٹھان رکھی تھی۔ وہاں ماسٹر صاحب کی لاچاری بے چارگی اور پریشان حالی دیکھ کر مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی پڑی اور ایک لاکھ روپیہ پھر

ہم نے بطور قرض بہرائچ سوسائٹی کو دیا۔ اور اس قرض پر جو معاہدہ فارم کی قیمت ہوتی تھی وہ کاٹ لی۔

ملی کونسل کے ہاتھوں لکھنؤ بلڈنگ کی فروختگی کا معاملہ

بہرائچ سوسائٹی کے حالات نے جب سنبھلنے کا نام نہیں لیا۔ تو مجبوراً لکھنؤ بلڈنگ کو فروخت کرنے کا ماسٹر صاحب نے فیصلہ کیا۔ اور ۲۳ر اکتوبر ۹۳ء کو مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی سے اعظم گڈھ میں بات کی۔ پھر فوری دہلی چلے گئے اور دہلی سے واپسی کے بعد مولانا مجیب اللہ صاحب سے لکھنؤ میں فروختگی کے معاملات طے ہوئے۔ پانچ لاکھ روپیہ فوری دینے کا وعدہ ہوا۔ ایک ماہ کے بعد کچھ اور باقی تین ماہ کے اندر روپیہ دے کر رجسٹری کرالینے کی بات طے ہوگئی۔ معاملات طے ہونے کے بعد پھر فوری ماسٹر صاحب و حاجی امین بیگ۔ طارق شفیق ندوی کے ہمراہ دہلی گئے۔ تین روز قیام کے بعد ۳ر نومبر ۹۴ء کو پہلی قسط جو پانچ لاکھ کی ملنی تھی۔ بمشکل تین لاکھ تیس ہزار ملے۔ ایک عشرہ کے بعد ایک لاکھ ستر ہزار پھر ملے۔ پانچ لاکھ کی رقم مل جانے کے بعد سوسائٹی کے حالات میں کچھ تبدیلی آئی۔

ماسٹر صاحب کا خط مولانا مجیب اللہ کے نام اور مولانا کا خط ماسٹر صاحب کے نام

وعدہ کے مطابق ایک ماہ بعد دوسری قسط "ملی کونسل" سے جب نہیں ملی۔ تو ماسٹر صاحب نے مولانا کو خط لکھا۔ جس کو من عن نقل کر رہا ہوں۔

محترمی و مکرمی جناب حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی صاحب

امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے۔ لکھنؤ کی بلڈنگ کے بارے میں میری آپ سے پہلی گفتگو ۲۳ر اکتوبر ۹۴ء کو اعظم گڑھ میں ہوئی تھی اس سلسلہ میں فوراً دہلی جانا ہوا اور واپسی لکھنؤ میں آپ کے اور ہمارے درمیان معاملات طے ہوئے۔

وعدہ تھا کہ پانچ لاکھ روپیہ فوراً۔ پانچ لاکھ ایک ماہ بعد باقی رقم ۳ ماہ کے اندر دیگر

کاروائی مکمل ہوگی بمشکل تمام پہلی قسط ۳ لاکھ تیس ہزار۔ ۳۰ر نومبر کی ۱۱ بجے شب ۳ یوم دتی کے قیام کے بعد ملے دوبارہ ایک عشرہ کے بعد ایک لاکھ ستر ہزار ملے پہلے میں دوسو روپیہ کم دوسر میں پانچ ہزار کی گڈی میں سبھی نوٹ خراب تھے دوبارہ دتی وغیرہ کے سفر میں پانچ ہزار خرچ ہوگیا۔ دوسرا وعدہ ایک ماہ کے بعد پورا نہیں ہوا۔ اسی سلسلہ میں پٹنہ بھی گیا۔ ممبئی میٹنگ کے دوران بھی کوئی لفٹ نہیں ملی۔ فروری کی ۳ر ۴ر کو لکھنؤ گیا۔ آپ کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی، پریشانی اور مایوسی میں پھر بہرائچ کی تین قیمتی جائدادیں فروخت کرنی پڑیں۔ کمیٹی کے افراد بھی نالاں اور بدگمان ہوئے۔ نجیب آباد کے ذمہ دار بھی بدظن ہو گئے اور تنظیم کی بدنامی ہوئی اور ساتھ ہی خسارہ اٹھانا پڑا بیماری کے باعث جس مصیبت میں پندرہ ماہ گذرے یہ میں اور میرا دل ہی جانتا ہے۔ معاملات کی خرابی کی فزا سے بڑے بڑے ادارے اور تنظیمیں فیل ہو گئے ہیں۔

کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کا پانچ لاکھ روپیہ بطور ضمانت میری سوسائٹی میں جمع ہے جب بھی آپ میری بلڈنگ خالی کریں گے کرایہ کاٹ کر باقی رقم واپس کردی جائے گی۔

ناچیز

فقط والسلام

نعیم اللہ خاں

ماسٹر صاحب کے خط کے جواب میں مولانا نے جو خط تحریر کیا اسے دیکھیے۔

مکرمی ماسٹر نعیم اللہ خاں صاحب السلام و علیکم

افسوس ہے لکھنا پڑ رہا ہے کہ آپ نے پانچ لاکھ کی رقم واپس نہیں کی حالانکہ آپ کو معاملہ ختم کیے ہوئے چار مہینہ ہو گئے۔ گویا ہماری رقم آپ کے پاس تقریباً آٹھ مہینہ سے رکی ہوئی ہے۔ برادرم نفیس صاحب اور عزیزی طارق شفیق آپ کی خدمت میں آرہے ہیں۔ براہ کرم پوری رقم حوالے کر دیں۔ دیانت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ معاملہ ختم کرتے ہی آپ کو رقم واپس کردینی چاہیے تھی۔

فقط خادم

مجیب اللہ ندوی

۱۲ر جون ۹۴ء

ماسٹر صاحب کے خط کے جواب میں مولانا کا خط نہلے پر دہلہ تھا۔ مجبوری معاملات کی خرابی کا باعث بنی۔ طارق شفیق ندوی نے اس کو ادھر ادھر ہوا دی اور اپنے پیٹ سے باتیں بنا بنا کر وہ کچھ کہتا رہا۔ جو ماسٹر صاحب نے نہیں کہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماسٹر صاحب کی پوزیشن خراب ہوتی گئی۔ "ملی کونسل" کو تین لاکھ پندرہ ہزار روپیہ مشکل قسطوں میں واپس ہو سکے۔ جس میں ڈیڑھ لاکھ کی ادائیگی لکھنؤ سوسائٹی نے بھی کی۔ پھر بھی ایک لاکھ پچاسی ہزار باقی رہا۔ اس طرح ماسٹر صاحب کی پوزیشن اکابرین تک میں خراب ہوئی۔

باہری روپیہ کی امید پر خواب کے محلوں کی تعمیر

جب آس اور امید کے سارے طوطے اڑ گئے اور سوسائٹی کی حالت سنبھلنے کے بجائے دن بہ دن بگڑتی ہی رہی تو بجائے اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کے باہر کے روپیہ کی جستجو اور کوشش شروع ہوئی۔ پھر کیا تھا۔ ان سے ملنا اُن سے ملنا، یہاں جانا وہاں جانا، اُن کو خط لکھنا، اُن سے کہنا، یہ ٹائپ کرانا وہ ٹائپ کرانا۔ سب کچھ ہوتا رہا۔ لیکن کہیں سے کوئی سبیل پیدا ہوتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ پھر بھی بس اب روپیہ آیا، بس اب روپیہ آیا۔ اسی آس اور امید میں خواب کے محل تعمیر ہوتے رہے اور ہم اُن محلوں پر بھی محل تعمیر کرنے کی سوچتے رہے۔ غرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے تیور اور ہمارے فکر و عمل میں ذرا سی بھی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ شاید جب زوال مقدر ہو جاتا ہے تو یہی حال ہوتا ہے۔

سوسائٹی کی درگاہ آراضی و محمد مقبول خاں صاحب

اس آراضی کو محمد مقبول خاں صاحب قطعاً خریدنے کے لئے تیار نہیں تھے حالانکہ یہ آراضی مہنگی فروخت ہو سکتی تھی۔ لیکن اس خیال سے کہ درگاہ کا معاملہ ہے۔ اگر کسی سیٹھ کے ہاتھوں مجبوری میں فروخت کر دی گئی۔ تو مستقبل میں اندیشہ ہے کہ درگاہ بھی جھگڑے و فساد کی آماجگاہ نہ بن جائے۔ اسی غرض سے مقبول صاحب پر ماسٹر نعیم اللہ کے علاوہ شہر کے بھی کچھ لوگوں نے دباؤ ڈالا۔ لیکن مقبول صاحب کسی طرح تیار نہیں ہوئے اور اسی

بات کو لیکر مقبول صاحب سے ماسٹر صاحب کی خفگی و ناراضگی بڑھ گئی اس سلسلے میں ہم نے بھی دو بار مقبول صاحب کو سمجھایا اور دونوں بار انھوں نے یہی کہا کہ اچھا پھر ایسا کریں گے۔ لیکن اس کے بعد بھی انھوں نے خریدنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ جبکہ سنّی سنٹرل وقف بورڈ اس آراضی کو خریدنے کی منظوری دے چکی تھی۔ پھر بھی مقبول صاحب لینے کو تیار نہیں ہوئے۔ بالآخر حالات اور دباؤ سے مجبور ہو کر انھوں نے خریدنے کی بنیاد پر ایک لاکھ روپیہ تو ضرور دے دیا۔ لیکن روپیہ دے کر ماسٹر صاحب کو لٹکا دیا۔ اور ماسٹر صاحب مزید روپیہ کا مطالبہ کرتے ہی رہے اور مقبول صاحب آگے پیچھے ہوتے رہے۔ اب تک جو بھی روپیہ مقبول صاحب نے ماسٹر صاحب کو دیا وہ خوب جھکا کر ہی دیا ہے۔ اس آراضی کو بنیاد بنا کر کچھ لوگوں نے مقبول صاحب کو بدنام کرنے کی طرح طرح کی کہانیاں گڑھنا شروع کر دیں اور یہ وہی لوگ تھے جن کی کچھ روزی روٹی کا دارومدار آستانے پر چڑھائے گئے چڑھاوے کی چوری سے ہوا کرتا تھا۔ مقبول صاحب نے ایسے لوگوں پر نہ صرف کڑی نظریں رکھیں بلکہ انھیں آستانے کے قریب دھنسنے اور گھسنے تک نہیں دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو چوریاں دھڑلّے سے ہوا کرتی تھیں ان میں بہت حد تک کمی ہو گئی اور وقف درگاہ شریف کی آمدنی سابقہ ایڈمنسٹریٹروں کے مقابلے کافی بڑھ گئی۔

جہاں تک مقبول صاحب کی بات ہے۔ وہ بذاتِ خود نہایت ایماندار اور سخت ہیں۔ لیکن ان کی خاں صاحبیت انھیں سوجھ بوجھ اور سیاست کرنے کا موقع فراہم نہیں کرتی۔ یہی ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ اپنی ایمانداری اور سختی سے درگاہ کی آمدنی میں اضافہ تو کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس وقف کی آمدنی سے درگاہ کو یا قوم اور ملت کو کوئی خاص فائدہ پہنچا سکیں۔ یہ خود مقبول صاحب کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ ان میں قوتِ فیصلے کی کمی بھی ہے درگاہ کی آمدنی بڑھانے اور رقم جمع کرنے کی ان کی ساری کوشش آنے والے دوسرے ایڈمنسٹریٹروں کے لئے سامانِ عیش فراہم کرنے کی ہے۔ ان میں چاپلوسی، مکھن بازی کرنے کی صفت بھی نہیں ہے اور نہ ہی وہ اپنی صدارت

بچانے کے لئے سابق ایڈ منسٹریٹروں کی طرح وقف بورڈ کے ذمہ داروں کو زیور گڑھا گڑھا کر پہنچانے کا کام کر سکتے ہیں۔ ان کی ایڈ منسٹریٹری عدالتی فیصلے پر منحصر ہے۔ بس یہی لوگوں کی مجبوری ہے۔ ورنہ سابق وقف منسٹر اعظم خاں بھی اس شخص کو نہیں چاہتے تھے۔ تو دوسرے وقف بورڈ کے ذمہ دار کیوں چاہیں۔ اس لئے کہ وہ ایماندار ہے جو لوگ ان پر بددیانتی و بے ایمانی کا الزام لگا رہے ہیں یا تو خود چور ہیں۔ یا غلط فہمی کا شکار ہیں یا حسد کی آگ میں جل کر ایسا کر رہے ہیں۔

مولانا ظہیر صاحب کا سفر بہرائچ

مولانا ظہیر احمد صدیقی اسٹوڈنٹس ویلفیر سوسائٹی کے صدر ہیں۔ آپ سے ماسٹر صاحب کی ملاقات سید راشد حسن صاحب کے ذریعہ ہوئی۔ ہوٹل کلارک اودھ میں مولانا نے ماسٹر صاحب کی ملاقات عرب کی ایک اہم شخصیت سے کرائی۔ گفتگو کے ضمن میں ان صاحب نے مولانا سے بہرائچ جاکر جائزہ لینے اور اپنی رپورٹ دینے کی درخواست کی۔ اسی سلسلے میں مولانا کا سفر بہرائچ ہوا۔ اس سفر میں ہم سید راشد حسن صاحب اور مولانا کے جنرل سکریٹری مولانا محمد طارق انور ندوی بھی ساتھ تھے۔ یہ سفر بذریعہ ٹیکسی ہوا۔ مولانا سے راستہ میں ہی سوسائٹی کے بارے میں میری خاصی گفتگو ہوئی۔ راستہ میں جرول سوسائٹی و اسکول دیکھ کر مولانا کافی متاثر ہوئے اس کے بعد پھر ہم لوگ بہرائچ کے لئے روانہ ہو گئے۔ بہرائچ پہنچ کر مولانا نے سوسائٹی دیکھی۔ پھر "ملی فارم" گئے۔ وہاں پڑے ادھورے تعمیری کاموں کا جائزہ لیا۔ جائزہ لینے کے بعد انھوں نے ماسٹر صاحب سے ایک سوال کیا کہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کی سکنڈ لائن کہاں ہے؟...... ماسٹر صاحب اس سوال کا کوئی معقول جواب تو نہیں دے سکے۔ الٹے جب فارم سے رخصت ہونے لگے تو شیخی جتانے کے لئے (میں اسے شیخی ہی کہوں گا) ایک مہمان کے سامنے مزدور سے کہنے لگے۔ تم لوگ بھٹے بھون کر کھالو۔ اور ایک سو بھٹے توڑ کر گھر دے آؤ۔ یعنی ایک مہمان کو یہ باور کرانا کہ سوسائٹی ہو یا ملی فارم یہ سب ہمارے گھر کی کھیتی ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم جو کرو سب صحیح دوسرا اگر اسی پر روک ٹوک کرے یا کچھ کہہ دے تو غلط ہے۔

جرول سوسائٹی و ملی اسکول

مولانا ظہیر احمد صاحب سوسائٹی اور اسکول دیکھ کر کافی متاثر ہوئے اور جرول اسکول کے

معائنہ رجسٹر پر اپنے تاثرات بھی تحریر کیے۔ دھیان رہے جرول ملی سوسائٹی اپنے آپ میں ایک خود کفیل سوسائٹی ہے۔ اس کے ذمہ دار وصی صاحب بظاہر ایک سیدھے سادھے کاروباری انسان نظر آتے ہیں۔ بات کے دھنی، معاملات کے سچے، ایماندار و دیانت دار ہونے کی وجہ سے جرول سوسائٹی میں آج تک کسی قسم کی گڑبڑی کی کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔ انھوں نے صدر سوسائٹی کے منصوبے و رائے کے مطابق جرول سوسائٹی کو چلانے و ترقی دینے میں بھرپور تعاون دیا۔ اور کبھی بھی صدر سوسائٹی کے حکم کے خلاف اپنی نہیں چلائی۔ بقول وصی صاحب لیکن" دکھ تب ہوا جب غلام مصطفےٰ وارثی عرف اچھن کے کہنے پر ماسٹر صاحب نے زیور وہاں رکھنے اور یہاں رکھنے کا حکم صادر کیا۔ اس وقت میں نے سخت رخ اپناتے ہوئے ضرور کہا تھا کہ ماسٹر صاحب سب کچھ تو ہم دے دیں گے۔ زیور کا چارج اس وقت تک نہیں دیں گے۔ جب تک گاؤں اور قصبہ کے ایک ایک فرد کا زیور واپس نہیں ہو جاتا۔"

وصی صاحب کا یہ اقدام قابل ستائش تھا۔ انھوں نے جرول سوسائٹی کی ذمہ داری آنکھیں کان کھول کر نبھائی۔ جس کا نتیجہ ہے کہ آج وہ نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ "ملی امدادی سوسائٹی بہرائچ" کی ایک عزت ہے۔ اور ماسٹر نعیم اللہ اپنی شاخوں میں اگر کسی پر ناز کر سکتے ہیں تو اسی ایک سوسائٹی پر۔ اس میں شک نہیں کہ ماسٹر صاحب کے منصوبے کے ہی مطابق یہاں کے ذمہ داروں نے آراضی خرید کر اسکول کی تعمیر کرائی اور انہی کے رائے و مشورے سے آج اس سوسائٹی کے زیر انتظام ایک بہتر اسکول چل رہا ہے۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا اس میں جرول سوسائٹی کے ذمہ داروں کی سنجیدگی کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ کیونکہ انھوں نے ماسٹر صاحب کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر بہرائچ سوسائٹی کو متعدد بار روپیہ ہوتے ہوئے بھی نہیں دیا۔ اور انھوں نے ہماری کہی ہوئی کانپور کی مسجد کی بات کو شاید یاد رکھا۔

حاجی امین بیگ

حاجی امین بیگ فخرپور سوسائٹی کے ذمہ دار تھے۔ آپ کے اندر ملی مفاد میں کام کرنے کا بے حد جذبہ تھا۔ سوسائٹی سے وابستگی اسی جذبہ کے نتیجہ میں تھی۔ آپ نہایت نیک

ہیت۔ ملنسار و با اخلاق تھے۔ ہر ایک سے محبت و سادگی سے ملنا ان کا حال احوال پوچھنا آپ کی خاص صفت تھی۔ وہ ماسٹر صاحب کے نہ صرف اندھے مقلدین میں تھے بلکہ ماسٹر صاحب ان کی نظر میں پیر و بزرگ کے درجہ میں داخل تھے۔ اور اسی لئے وہ ماسٹر صاحب کی خدمت و دلداری کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ انھوں نے ماسٹر صاحب کی ہاتھ پیر د سر دبانے سے لیکر ہر طرح خدمت کی۔ بقول مختار پردھان (اکونہ) ہم لوگ وزیر گنج ماسٹر صاحب کے ساتھ کہیں گئے تھے کہ راستہ میں ایک جگہ اترنا پڑا۔ کیچڑ بہت تھا۔ ماسٹر صاحب کا جوتا کیچڑ میں بھر گیا۔ پانی وہاں تھا نہیں۔ حاجی صاحب نے ماسٹر صاحب کا جوتا و پیر اپنے اس بڑے رومال سے جو ان کے کندھے پر پڑا ہوا تھا۔ فوراً نہ صرف پونچھ ڈالا۔ بلکہ جوتے کو بھی رگڑ رگڑ کر رومال سے صاف کر ماسٹر صاحب کو جوتا پہنا دیا... حاجی صاحب کے اس عمل کا مختار پردھان نے کوئی اچھا تاثر تو نہیں لیا۔ الٹے انھوں نے جو کہا اسے دہرا کر حاجی صاحب کی سبکی نہیں کرنا چاہتا۔ اور نہ پردھان جی کی بات سے متفق ہوں جو انھوں نے ابھی حال میں حاجی صاحب کے سلسلے میں کہے ہیں۔ کیونکہ وہ حاجی صاحب کو کیا جانیں؟

یہاں دسیوں و درجنوں بار حاجی صاحب کے ساتھ سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا ہے اور ویسے بھی میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ شخص یقیناً اخلاص کا پیکر تھا۔ ان میں کسی قسم کا کوئی بناوٹی رنگ نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ وہ ڈرائیور لائن کے آدمی تھے۔ اس لئے بعض وقت اس کی جھلک ان میں ضرور نمایاں ہو جاتی تھی۔ اور اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے؟۔ کہ وہ سوسائٹی کے دیوانوں میں سے ایک دیوانہ نہیں تھا۔ مجلس عامہ و مجلس منتظمہ کی کل تعداد میں سے معدودے چند افراد ہی ایسے ملیں گے۔ جن پر سوسائٹی کی دیوانگی کا بھوت سوار تھا۔ وہ سوسائٹی کے لئے کچھ کر پائے ہوں یا نہ کر پائے ہوں۔ لیکن سوسائٹی و ماسٹر صاحب کے پیچھے کافی کچھ اپنا وقت برباد کیا۔ اور اس بات سے کیا ماسٹر صاحب انکار کر سکتے ہیں؟.... لیکن افسوس ہے کہ ماسٹر صاحب کو اپنی پریشانی و قربانی کا ایک ایک لمحہ و ایک ایک پیسہ یاد ہے اور دوسرے کی دی ہوئی بڑی سے بڑی قربانی انھیں کبھی یاد نہیں رہی۔ حاجی امین بیگ نے جو بھی کچھ غلطی کی۔ اس کے لئے وہ پشیمان اور شرمندہ ہیں۔ اس سلسلے میں وہ دوبار

مجھ سے ملاقات کی غرض سے لکھنؤ میرے گھر آئے۔ اور کہنے لگے کہ شمیم میاں لکھنؤ سوسائٹی و فخرپور سوسائٹی کا جو بھی روپیہ ہمارے ذمہ ہے۔ ہم وہ سب پائی پائی ادا کر دیں گے جب وہ یہ بات کہہ رہے تھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاکر اپنے دل کا درد بیان کرتے کرتے رونے لگتے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا ہم اسے بیان نہ کر اسی پر اکتفا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ حاجی صاحب اپنی بات کے دھنی ثابت ہوں گے۔

حضرت مولانا قاری صدیق صاحب کے پروگرام رکھنے کا مقصد

سوسائٹی کے حالات بہتر بنانے کی غرض سے مولانا سے دو روز کا پروگرام لیا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ شاید مولانا کی آمد وان کی دعاؤں کی برکت کے طفیل سوسائٹی کے حالات بہتر بن جائیں دوسرے مولانا کی نسبت سے عوام کا رجحان سوسائٹی کے متعلق تبدیل ہو جائے۔ یہی نقطہ نظر مولانا کے پروگرام رکھنے کا باعث بنا۔

قاری صاحب کے پروگرام کی تفصیلی رپورٹ و ناصحانہ تقریر

۲۲ اکتوبر ۱۹۹۴ء صبح اٹیا تھوک ضلع گونڈہ سے پروگرام[1] کا آغاز ہوا۔ حضرت نے ایک اہم اور نمائندہ جلسے کو خطاب کیا۔ وہاں سے اکونہ ضلع بہرائچ میں اسلامک اسکول کا سنگ بنیاد رکھا اور وعظ و نصیحت سے سرفراز فرمایا۔ پھر بھنگا ضلع بہرائچ میں اسلامک اسکول کا معائنہ فرما کر نیز اپنے ناصحانہ کلمات سے نوازتے ہوئے شام کو جمہا بانزار اور رطی پور ضلع بہرائچ کی دفتر کی عمارت کا افتتاح فرمایا اور ایک عظیم اہم اجلاس کو اپنی مفید اور قیمتی باتوں سے مستفید فرمایا۔ رات کو قیام ملی سوسائٹی بہرائچ کے کمپلکس میں رہا۔ اور تقریباً رات دس بجے مدرسہ ہدایت الاسلام بشیر گنج بہرائچ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور اجلاس عام میں تقریر فرمائی۔

۲۳ اکتوبر صبح ملی اسلامک اسکول جو ملی کامپلکس میں چل رہا ہے۔ اس کا جائزہ لیا پھر ساڑھے دس بجے قصبہ فخرپور میں سوسائٹی و دیگر باقی کاموں کا جائزہ لیا اور دعا فرمائی۔ تقریباً ایک بجے موضع رکنا پور کی نو تعمیر شدہ عظیم الشان مسجد میں تقریر فرمائی اور ایک اسلامی مدر

---

[1] یہ پروگرام کی تفصیلی رپورٹ مولانا صلاح الدین قاسمی قیصر گنج کی تحریر کردہ ہے۔

کی بنیاد رکھی و دعا فرمائی۔ بعد نماز ظہر قصبہ جرول میں ملی اسلامک اسکول کے چند بچوں کے دینی پروگرام کا معائنہ فرمایا۔ اور ایک اہم اجلاس کو خطاب فرمایا۔ حضرت کی تقریر سے قبل ماسٹر نعیم اللہ صدر سوسائٹی نے حضرت کا شکریہ ادا کیا اور سفر میں پہنچنے والی تکلیفوں کی معافی چاہی۔ اور حضرت کی سرپرستی ہیں اور قوم کے اخلاص و تعلق کے زیر سایہ مستقبل میں بھی کام کرتے رہنے کے عزم کا اظہار فرمایا۔ حضرت قاری صاحب نے قوم کو نہایت مفید اور دل کو جھنجھوڑنے والی اور قلب کو بیدار کرنے والی نصیحتیں فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اے ایمان والوں دنیوی الجھنوں اور آفتوں سے تنگ دل نہ ہو۔ نہ مایوس ہو۔ نہ ڈرو بلکہ اپنے ایمان کو مضبوط کرو اور خدا سے سچا تعلق پیدا کرو۔ تمام مشکلات کا حل کرنے والا وہی ہے۔ امتحان اسی کا ہوتا ہے جو اسکول کے رجسٹر میں نام لکھوانا ہے۔ تم نے اگر ایمان والوں کے رجسٹر میں اللہ کے یہاں نام لکھوایا ہے تو امتحان بھی ہونا ہے۔ جب تک امتحان کے پرچہ کا صحیح حل کوئی نہ کرے گا کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ کتنی خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امتحان کے پرچہ کا حل بھی بتادیا کہ قرآن کے اصولوں پر چل کر اور رسول پاکؐ کے بتائے ہوئے طریقے کو اپنا کر ہی مسلمان کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ مسلمان خدا کے بتائے ہوئے حل کو نظرانداز کر کے من مانے طریقوں میں کامیابی ڈھونڈ رہا ہے اور عمل سے ہٹ کر دہ بازی میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اس انداز فکر کو بدلنا پڑے گا۔ پھر حضرت کی دعا پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

خواب کی حقیقت ظاہر ہوگئی

حضرت قاری صاحب کا پروگرام ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ سوسائٹی زبردست بحرانی حالات سے دوچار ہو گئی۔ روپیہ کی واپسی اتنی شدت کے ساتھ شروع ہوئی کہ ایک لمحہ کے لئے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ دسیوں لاکھ کی زمین و زیور فروخت ہوئے۔ لیکن حالات قابو میں نہیں آئے۔ صورت حال اتنی بگڑ گئی کہ دس روپیہ بیس روپیہ کا ڈرال ہونا مشکل ہو گیا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مولانا کا پروگرام جس منشاء و مقصد کے تحت لگایا گیا تھا۔ وہ حاصل ہونے کے بجائے اس کا الٹا ہو گیا۔ مولانا کی دعائیں اور ان کی آمد کی برکت کام نہیں آئی۔ اور بانده کے اس خواب کی حقیقت ظاہر ہو گئی کہ ـــــــ: اگر ماسٹر نعیم اللہ نے اپنی اصلاح

نہیں گی تو بزرگوں کی دعائیں بھی انھیں بچا نہیں سکتیں۔ اور سوسائٹی کی ۲۳ سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ تالا پڑ گیا۔ بہرائچ سوسائٹی اور اس کی بیشتر شاخیں مکمل بند ہو گئیں اور پھر وہ حالات رونما ہوئے اور وہ درگت پر درگت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اس طرح قدرت کو جب دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ تو وہ ایسے ہی دکھاتی ہے۔ انہی حالات میں ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ء کو چھ مقامی افراد نے جن میں جناب مسعود الحسن صاحب، ڈاکٹر عبدالودود صاحب، مولانا محمد ہارون قاسمی صاحب، ڈاکٹر داود الحق صاحب اور محمد اقبال صاحب نے ایک مشترکہ توجہ نامہ صدر سوسائٹی ماسٹر نعیم اللہ کو دیا۔ توجہ نامہ دینے والوں کی نیت کیا تھی ہمیں اس سے بحث نہیں۔ لیکن جو کچھ توجہ نامہ میں تحریر تھا بجز دو باتوں کو چھوڑ کر کچھ بھی تو غلط نہیں تھا۔ پھر بھی ہم نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس لئے کہ اس میں ہماری کمزوریاں اجاگر کی گئی تھیں۔ اور ماسٹر صاحب یہ بات یاد کر لیں کہ جب تک وہ اپنی اصلاح نہیں کریں گے۔ نہ بزرگوں سے ان کا تعلق کام آئے گا اور نہ ہی ان کی دعائیں۔ انھیں بچا سکیں گی۔

مولانا ظہیر احمد صدیقی کے نام خط

قاری صاحب کے پروگرام کے بعد سوسائٹی کے حالات جس تیز رفتاری سے بگڑے اسے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ قاری صاحب کا پروگرام جس وقت لگایا گیا تھا جس وقت قاری صاحب بہرائچ تشریف لائے اس وقت سوسائٹی کے حالات اگر اچھے نہیں تھے تو خراب بھی نہیں تھے۔ مگر واہ رے قدرت تو نے دکھا دیا، سمجھا دیا کہ جب بگاڑ خیر کے مقابلے غالب آجائے تو بزرگوں سے تعلق وان کی دعائیں بھی کام نہیں آتی۔ بہر حال ماسٹر صاحب انہی حالات میں لکھنؤ آئے۔ کہنے لگے کچھ روپیہ دے دو۔ مجھے ان پر ترس بھی آرہا تھا اور غصہ بھی۔ میرے پاس روپیہ اتنا تھا ہی نہیں جو میں ان کی مدد کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر انھوں نے مولانا ظہیر احمد صدیقی سے ملاقات کرنے کا من بنایا۔ میں نے کہا کہ ابھی نیا نیا معاملہ ہے یک بیک اس قسم کی بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ ملاقات تو کر لیں۔ لیکن اس قسم کی کوئی بات نہ کریں بہت ہے تو آپ مولانا کے نام خط لکھ کر مجھے دے دیں میں ان سے مل کر گفتگو کروں گا۔ اگر مجھے ذرا بھی محسوس ہوا کہ یقیناً مولانا مدد کر دیں گے تو پھر خط ان کے حوالے کر دوں گا۔ راستہ

چلنے میری اتنی بات ماسٹر صاحب سے ہوئی۔ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مولانا کسی کا انتقال ہو جانے کے سبب باہر گئے ہوئے ہیں۔ پھر ماسٹر صاحب نے خط لکھ کر مجھے دے دیا۔

دو روز کے بعد ہم نے مولانا سے ملاقات کی ادھر ادھر کی تمام باتیں کرنے اور پوچھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مولانا قطعاً مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اس لئے پھر وہ خط مولانا کو نہیں دیا۔ دیکھئے مولانا کے نام تحریر کردہ خط۔

محترم مولانا ظہیر احمد صدیقی صاحب۔ السلام وعلیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر ہوں گے میں کل صبح بہرائچ سے لکھنؤ کے لئے چلا۔ شام کو پہونچا۔ صبح آپ کے دولت خانہ پر حاضری دی۔ پتہ چلا کہ آپ کے کسی رشتہ دار کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ بہرائچ گئے ہیں۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ خداوند کریم صبر عطا فرمائے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسی طرف سے تلسی پور روانگی ہو گئی۔ شب ۸ بجے تک انتظار کیا واپس جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں ملاقات ہوگی۔ شاید ضرورت سے آیا تھا۔ اس وقت بہرائچ سوسائٹی میں مالی پریشانی ہے۔ روپیہ قرض میں پھنسا ہوا ہے۔ مقروض بار بار تقاضے پر واپسی میں تاخیر کر رہے ہیں۔ زمین جائداد بھی فوراً فروخت نہیں ہو رہی ہے۔ سبھی ہفتہ عشرہ کا وقت مانگ رہے ہیں۔ کچھ زمین جائداد لکھنؤ روڈ کی نکال رہا ہوں انشاء اللہ عشرہ پندرہ یوم میں انتظام ہو جائے گا۔ سردست فوراً تین لاکھ روپیہ کی شدید ضرورت ہے۔ اگر آپ لکھنؤ سوسائٹی میں کل ہی جمع کر دیں تو ادارہ مالی بحران سے بچ جائے گا۔ میں انشاء اللہ یہ رقم جلد ہی واپس کر دوں گا۔ تھوڑے لکھے کو زیادہ خیال کریں۔ محمد شمیم صاحب یا سید راشد حسن صاحب سے بھی مشورہ کر لیں یا بات کر لیں۔

فقط

والسلام ناچیز

محمد نعیم اللہ

چار چھ روز کے بعد ماسٹر صاحب پھر روپیہ کی غرض سے لکھنؤ آئے۔ ہم نے مولانا سے ملاقات ہونے کا تذکرہ کیا اور صورت حال واضح کرتے ہوئے کہا کہ مولانا سے اس سلسلے میں کسی قسم کی بات کرنا مناسب نہ ہوگا۔ بات چیت سے ہم نے اندازہ کر لیا ہے کہ وہ آپ

کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اس لئے ہم نے خط نہیں دیا۔ یوں مولانا سے ملاقات کرلیں۔ لیکن اس معاملے میں کوئی بات نہ کریں۔ ماسٹر صاحب نے ملاقات تو کی لیکن کوئی بات نہیں کی اور مایوس ہوکر پھر بہرائچ روانہ ہو گئے۔

جدید مرکز کی خبر مسلم فنڈ والوں کی آمد بلڈنگ کی فروختگی ماسٹر صاحب سے تلخ گفتگو و خط

سوسائٹی میں تالا پڑ جانے اور سوسائٹی بند ہوجانے پر اخبار جدید مرکز نے ۴ر دسمبر ۱۹۹۴ء کے شمارے میں مع سوسائٹی کے فوٹو کے ساتھ خبر کی سرخی لگادی کہ " کھاتہ داروں کو پریشانی کا سامنا۔ ملی امدادی سوسائٹی میں تالا لگا"۔ اس خبر سے لکھنؤ سوسائٹی بھی کافی متاثر ہوئی۔ اس اخبار کو دہلی میں جب نجیب آباد مسلم فنڈ کے لوگوں نے پڑھا۔ تو انھوں نے اپنے منیجر جناب اظفار الحق ذکی کو فون پر اطلاع دی۔ ذکی صاحب نے اقبال صاحب کو فوری طور پر لکھنؤ اور بہرائچ کے لئے روانہ کیا اور معاملات طے کرنے کی ہدایت کی۔ اقبال صاحب لکھنؤ آئے۔ مجھ سے حالات دریافت کئے اور پھر بہرائچ چلے گئے۔ ماسٹر صاحب سے بات چیت میں لکھنؤ بلڈنگ کی فروختگی و لکھنؤ سوسائٹی دئے جانے کا معاملہ طے ہو گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد" مسلم فنڈ کے لوگ مع اپنے پورے اسٹاف کے ساتھ سات لاکھ کا ڈرافٹ لے کر طے شدہ تاریخ کے مطابق لکھنؤ پھر حاضر ہوئے۔ کسی طرح کی کوئی شرط کے بغیر کچہری میں پانچ روپیہ کے اسٹامپ پر معمولی لکھا پڑھی ہوئی۔ اور پانچ لاکھ کا ڈرافٹ ماسٹر صاحب لے کر بہرائچ چلے گئے دو لاکھ لکھنؤ سوسائٹی کو اس غرض سے دے گئے کہ بقایا رقم "ملی کونسل" کو دے کر کمرہ خالی کرالو۔ میں نے اسے بینک میں جمع کر دیا۔ کلیرنس ملنے کے بعد یہی رقم "ملی کونسل" کو دی گئی۔ مسلم فنڈ کو لاج کا چارج دے دیا گیا۔ پھر سوسائٹی کے حسابات کی جانچ شروع ہوئی۔ اور دوسری طرف ہم نے زیورات کا چارج دینا شروع کیا۔ اکیانوے زیوروں تک کا چارج دیا جاچکا تھا کہ سوسائٹی کے حسابات کے فرق نے سارے معاملے کو کھٹائی میں ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زیوروں کا لیا گیا چارج انھوں نے واپس کردیا۔ اور کہنے لگے کہ آپ اپنے صدر صاحب کو بلائیں۔ بغیر کسی تحریری لکھا پڑھی کے ہم سوسائٹی میں ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ اس صورت حال

سے میری پریشانی بڑھ گئی۔ میں نے رات ۳ بجے اپنے چھوٹے بھائی کو سوتے سے جگا کر فوری بہرائچ خط دے کر روانہ کیا۔ خط میں دوسری تمام باتوں کے علاوہ یہ جملہ بھی تحریر تھا کہ — کم لکھے کو زیادہ سمجھیں۔ ہمیشہ کی طرح ہماری اس تحریر کو معمولی اور سرسری انداز سے نہ لیں اور فوری پرچہ ملتے ہی لکھنؤ کے لئے روانہ ہو جائیں۔ اور یہ ۲۳ دسمبر ۹۴ء کا واقعہ ہے۔

خیر خط ملتے ہی ماسٹر صاحب روانہ تو ہوئے لیکن لکھنؤ کافی دیر میں پہنچے کردہ دگ جا چکے تھے۔ بس کیا تھا کہ جھلاّہٹ اور غصّے کا عتاب نازل ہونا شروع ہوا۔ کہنے لگے تمہارے جیسے ایک دو پیدا ہو جائیں تو آدمی خودکشی کر لے۔ میں نے کہا کہ خودکشی کے حالات تو آپ نے خود پیدا کر دئے ہیں۔ اور ہم پریشان ہوں گے تو آپ کو پریشان کریں گے اور چھوڑیں گے نہیں۔ کہنے لگے کہ تم بزدل ہو، گدھے ہو، بے وقوف ہو۔ میں نے کہا میں یہ کب کہتا ہوں کہ یہ نہیں ہوں میں تو یہ سب ہوں ہی اور اسی لئے تو میں نے سوسائٹی کا چارج دئے جانے کی بات کہی تھی۔ کہنے لگے تو پھر چارج کیوں نہیں دے دیا تھا۔ میں نے کہا کہ ایسے ہی چارج دے دیا جاتا ہے آپ کہتے ہیں تو جائیے آج سے چارج دے دیا۔ اس تلخ گفتگو کے وقت عقیل اللہ عرف شاہد، ہمارے چھوٹے بھائی محمد وسیم اور اسٹاف کے کچھ لوگ موجود تھے۔ مجھے بھی غصہ تھا۔ میں نے پھر کہا کہ اپنا کرے تو آنکھ بند کر لو اور دوسرا کرے تو آنکھ کھول لو۔ یہ دوہرا معیار نہیں چلے گا۔ اتنا کہنا تھا کہ غصہ بڑھ گیا۔ کہنے لگے کہ کب میں نے ایسا کیا؟ میں نے کہا کہ کیا نہیں تو کیسے کہہ رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ آج حالات خراب ہیں تو تم بھی وہی کہہ رہے ہو جو دوسرے کہہ رہے ہیں اور کل جب حالات ٹھیک تھے تو سب ٹھیک تھا۔ میں نے کہا ایسا نہیں ہے ہم نے آپ کے ہر غلط اقدام پر روک ٹوک کی۔ پھر گفتگو ختم ہو گئی۔ ماسٹر صاحب بجائے رکنے کے ناراض وخفا ہو کر رات ہی کو فوری بہرائچ کے لئے روانہ ہو گئے۔ تلخ گفتگو کا یہ واقعہ ۲۴ دسمبر ۹۴ء کو پیش آیا۔

اس گفتگو کے دوسرے دن یعنی ۲۵ دسمبر ۹۴ء کو صرف سابقہ دو خطوں کی فوٹو کاپیاں

لہ دیکھئے صفحہ ۔ ۱۸ مئی ۹۱ء کا خط

جو پچھلے صفحات میں بھی تحریر کیے گئے ہیں مزید ایک خط لکھ کر منسلک کر کے دستی ماسٹر صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ دیکھیے خط کا متن۔

محترم جناب ماموں صاحب السلام و علیکم

پرسوں ہم نے آپ سے کچھ تلخی کے ساتھ بات کرنے کی جو جرأت آپ کے غصہ کرنے پر کی اس کا مجھے افسوس رہا۔ لیکن آپ کا یہ کہنا کہ آج جب حالات خراب ہیں تو تم بھی وہی کہہ اور کر رہے ہو جو دوسرے کہہ اور کر رہے ہیں اور جب حالات ٹھیک تھے تو سب ٹھیک تھا۔ ایسی بات نہیں۔ میں نے اچھے حالات میں بھی آپ کو زبانی اور تحریری دونوں طرح سے آگاہ کرتا رہا ہوں۔ اب آپ اسے نہ سنیں یاد نہ رکھیں اور سوچیں اور غور نہ کریں یہ آپ کا کام ہے۔ میرا کام کہنے اور لکھنے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔؟ ...... جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۸۸ء کے بحران کے بعد سے آپ کے خود کے اندر بہت کچھ بگاڑ آ گیا۔ آپ نے اپنا اور اپنے کام کا محاسبہ کرنے کے بجائے دوسروں کے کاموں اور عیبوں کے آپ محاسب بن گئے اور ان کا محاسبہ شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کی خواہ کسی بھی نوعیت کی غلطیاں ہوں چھوٹی ہوں یا بڑی کا آپ نے نکیر کی۔ لیکن اپنے طریقہ کار میں خواہ فکری ہوں یا عملی نظر کرم نہیں کیا۔ جس نے بھی اگر کوئی بات کہی تو اس کی تاویلیں اپنے ڈھنگ سے پیدا کر کے اس پر جھلاہٹ اور غصہ کا عتاب نازل کیا۔ لیکن میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ آپ پریشان اپنی ذات سے ہیں۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔

جہاں تک مخالفین و حاسدین کی بات ہے۔ ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ انھوں نے آپ کی کمزوریوں کا صرف فائدہ اٹھایا ہے اور اٹھا رہے ہیں۔ ....

ہر جگہ مخالفین و حاسدین کا گلا شکوہ کر کے آپ نہ اپنے کو بچا سکتے ہیں اور نہ سوسائٹی کو۔ اصل نشانہ پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے ادھر ادھر نشانہ [illegible] بھٹکنا ہی آپ کے زوال کا سبب ہے۔ سوچیں اور غور کریں یہی میری آپ سے گزارش ہے۔ ابھی پھر بھی اتنا کچھ بگڑا نہیں ہے۔ .... اس خط کے ساتھ ایک خط منسلک کر رہا ہوں جس میں پرانے خطوں کے اقتباس درج ہیں۔ اور یہ اس بات کی صفائی کے پیش نظر منسلک کر رہا ہوں۔

جو آپ کہتے ہیں کہ آج جب تمہارے حالات ہیں تو تم بھی وہی کہہ رہے ہو جو دوسرے کہا اور کر رہے ہیں۔

فقط والسلام
محمد شمیم
۲۵ دسمبر ۱۹۹۴ء

پروگرام افطار پارٹی

مولانا کو سید راشد حسن صاحب کے ذریعہ جب یہ معلوم ہوا کہ لکھنؤ سوسائٹی و بلڈنگ مسلم فنڈ نجیب آباد نے خرید لی ہے۔ تو مولانا کو افسوس و تعجب ہوا۔ کہنے لگے "ملی سوسائٹی تو غنیمت تھی۔ لیکن ان کا تو پورا طریقہ کار سودی ہے۔ پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ سب ہوا کیسے۔ میں نے بات کو پورا خلاصہ کرتے ہوئے صاف لفظوں میں ان سے کہہ دیا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ ہمارے صدر صاحب کی خودسری و خودپسندی کا نتیجہ ہے۔ پھر میں نے اپنے خطوں کی فوٹو کاپیاں بھی انھیں دیں۔ مولانا کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ ماسٹر صاحب کی مخالفت بہرائچ میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ مگر وہ سوسائٹی کے ذریعہ کئے گئے کاموں سے بے حد متاثر تھے۔ اور اسی لئے انھیں ماسٹر صاحب سے ہمدردی تھی اور اسی ہمدردی کے نتیجہ میں سید راشد حسن صاحب سے صلاح مشورہ کے بعد ملی امدادی سوسائٹی کے توسط سے بہرائچ میں افطار پارٹی کا پروگرام بنایا کہ اس سے ماسٹر صاحب کی مخالفت میں بھی کمی آئے گی اور دوسرے پروگرام بھی ہو جائے گا۔ اسی غرض سے سید راشد حسن صاحب کو بہرائچ بھیج کر ماسٹر صاحب کی منظوری حاصل کی۔ عنقریب پروگرام کے چار روز پہلے عقیل اللہ عرف شاہد (جیسا کہ مجھے معلوم ہوا) کہ مولانا کے پاس روپیہ کے لئے حاضر ہوئے۔ مولانا نے اپنے جنرل سکریٹری مولانا محمد طارق انور ندوی سے مشورہ کرنے کے بعد روپیہ دینے میں معذوری ظاہر کر دی۔ شاہد میاں مایوس ہو کر بہرائچ واپس ہو گئے۔ عین پروگرام سے ایک دن پہلے جب سید راشد حسن بہرائچ پہنچے۔ تو ماسٹر صاحب سے کھڑے کھڑے ملاقات کی۔ ماسٹر صاحب نے افطار پروگرام نہ کر سکنے کی معافی چاہی۔ اور حقیقت یہی تھا ہے کہ اس وقت

جو حالات تھے اس میں ماسٹر صاحب کا سوسائٹی جانا کسی آفت سے کم نہیں تھا۔ لیکن افطار پارٹی نہ کر سکنے کے سلسلے میں جو جھوٹ اور سچ کا سہارا لیا۔ اس نے ماسٹر صاحب کی پوزیشن اور خراب کی۔ ایک ذمہ دار شخص نے مجھے سنانے کے لئے یہاں تک کہہ دیا کہ ـــــ ہم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ماسٹر صاحب اتنا کھلا اور صاف جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔" مجھے یہ سن کر افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔

صدر سوسائٹی کے نام سولہ نکاتی سوال نامہ

۱۸ اگست ۹۵ء کو صدر سوسائٹی ماسٹر نعیم اللہ کی خدمت میں بذریعہ ڈاک ہم نے ایک ۱۶۔ نکاتی سوال نامہ تحریر کیا اور اس کی فوٹو کاپیاں کچھ مخصوص اراکین سوسائٹی کو بھی بھیجی گئیں ہیں ۵ ستمبر ۹۵ء کو بطور یاد دہانی ایک ریمانڈر مع سوال نامہ کی فوٹو کاپی کے ساتھ دستی پھر روانہ کیا ہے۔ سوال نامہ میں کیا ہے؟ ...... اس کا تذکرہ سوسائٹی کے مفاد میں فی الحال نہیں ہے اور نہ عام لوگوں کے لئے مناسب ہے۔ وقت آنے پر اگر مناسب سمجھا گیا تو الگ سے شائع کر دیا جائے گا۔

سوال نامہ پر صدر سوسائٹی کا ردِ عمل۔

عزیزم سلامت رہو۔

بلا تحقیق و تصدیق ایک تا سولہ سوالات مجھ سے کر کے دیگر اراکین کو مطلع کر کے بہت بڑا تیر مار لیا ہے۔ اہتمام سے قبل ایک تا نو وچودہ پندرہ بھرا ایچ آکر اکاؤنٹنٹ یا مینیجر سے پتہ لگا کر ہی اتنی لمبی فہرست بنا کر دیتے۔ رہا دس تا تیرہ اور سولہ مجھ سے پوچھ لیتے۔ خیر بہت جلد آکر سبھی کو بلا کر مکمل معلومات فراہم کر کے سزا دینے کی جدوجہد کریں۔ کیوں کہ دوبارہ لیٹر سے پتہ چلتا ہے کہ ملزم دس بیس لاکھ لے کر کہیں فرار نہ ہو جائے۔ مجھے کسی کو نہیں بلانا ہے۔ خیر جلدی کریں اور جو کسر باقی ہو اس کو منظر پر لے آویں۔ کیونکہ ابھی اور بہت کچھ باقی ہے۔ فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے۔

فقط

آپ بے ایمان صدر

محمد نعیم اللہ

۷ ستمبر ۹۵ء

اگر بلا تحقیق و تصدیق کچھ سوال کر ہی لئے گئے تھے۔ تو پھر اس میں آنا خفا ہونے کی کیا بات تھی؟ ..... یہ جھلاہٹ بھرا خط کس کی کمزوری اجاگر کر رہا ہے۔ یہ فیصلہ صرف قارئین کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس خط کا جواب بھی صدر صاحب کو دے دیا ہے۔ لیکن ادارہ کے مفاد میں مکمل خط شائع کرنا اسی طرح مناسب نہیں ہے۔ جس طرح سولہ نکاتی سوال ناموں کا شائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ پھر بھی لوگوں کی تسلی و تشفی کے لئے خط کے اقتباسات پیش کرسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

جناب صدر صاحب ملی امدادی سوسائٹی بہرائچ

السلام و علیکم۔

آپ کا ارسال کیا ہوا خط آج بتاریخ ۱۴ ستمبر رات ۸½ بجے گھر پر نسیم محصل کے ذریعہ اس وقت ملا ہے۔ جبکہ میں بخار میں مبتلا ہوں۔ آپ نے خط میں تیر مارنے کی بات لکھی ہے۔ یقیناً ہم نے تیر تو نہیں مارا ہے اور نہ ہمارا تیر مارنے کا مزاج ہے۔.........

ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم نے آپ سے کچھ پوچھنے کی جرأت کر لی ہے۔ دوسروں سے ہر کچھ پوچھنے کا، اس کو سزا دینے کا، نکالنے کا، ذلیل و رسوا کرنے کا۔ آپ کو حق و اختیار پوری طرح حاصل ہے۔ لیکن دوسرا اگر آپ سے کچھ پوچھنے کی جرأت کرلے۔ تو یہ حق اس کو حاصل نہیں ہے کیونکہ آپ صدر ملی امدادی سوسائٹی ہیں۔ جہاں کا صدر کسی قانون اور قاعدے کا پابند نہیں ہوتا۔

آپ نے تحریر کیا ہے کہ اکاؤنٹنٹ یا مینیجر سے پتہ لگا لیتے اور مجھ سے پوچھ لیتے۔ کتنا پتہ لگاتے؟ ..... کتنا پوچھتے؟ ..... یا صرف پوچھتے ہی رہتے..........

میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ نے یہ مسئلے حل کر دئے۔ یہ ایک بات ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم آپ سے کیوں پوچھیں؟ جب آپ کسی بھی معاملے میں کسی سے کچھ پوچھتے نہیں۔ کسی سے مشورہ کرتے نہیں۔ تو آپ کو بھی یہ امید نہیں رکھنی چاہیئے کہ دوسرا آپ سے پوچھے۔ اگر ہم نے آپ سے پوچھے بغیر اراکین سوسائٹی کو کاپیاں بھیج دیں۔ اور بقول آپ کے بلا تحقیق

لہ حاجی امین بیگ۔ مولانا محمد عظیم خاں، سید وصی الدین

و تصدیق سوال پوچھ لئے ہیں تو پھر اس میں اتنا گھبرانے اور تیر مارنے کی بات کیا ہے؟ آپ صفائی و جواب دے دیتے تو سوال پوچھنے والا خود ذلیل و رسوا ہو جاتا۔ آپ نے خط میں فرار ہونے کی بات بھی لکھی ہے۔ لیکن آپ فرار ہو کے جائیں گے بھی کہاں؟ ......

ڈر تو مجھے اپنے فرار ہونے کا لگا ہوا ہے کہ کہیں میں خود ملک عدم نہ فرار ہو جاؤں۔ اس لئے ملت اور قوم کے مفاد میں عجلت اور جلد بازی سے کام لے رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے نقطۂ نظر کو سمجھ رہے ہوں گے۔

ہمیں آپ کے خط کے جواب سے یقیناً اطمینان حاصل ہوتا۔ لیکن آپ نے اطمینان یہ دکھا کر پیدا کر دیا کہ آپ کے پاس حقائق کا مقابلہ کرنے کے لئے اب جھلاہٹ اور غصہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ آپ کے غصّہ کی طاقت کی مزاحمت کے لئے ہم یقیناً کوئی طاقت نہیں رکھتے اور اس کا کوئی سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم آپ سے مزاحمت کریں۔ لیکن ہمارا احساس فرض جو ہمارے دل و دماغ کی سب سے عزیز متاع ہے۔ اس نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم آپ سے کچھ سوال کریں۔ بھیجا گیا سوال نامہ اسی احساس فرض کے نتیجہ میں تھا۔ آپ نے لکھا ہے کہ مجھے کسی کو نہیں بلانا ہے۔ یہ آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے۔ آپ بلائیں گے کسے اور کس بل بوتے پر بلائیں گے۔ کوئی بھی تو اب آپ کا ہم نوا نہیں ہے جو آپ کی ہاں میں ہاں ملائے۔

آپ نے سزا دینے کی جد و جہد کی بات بھی لکھی ہے۔ یہ سزا کیا کم ہے کہ آپ کی بے چینی بڑھ گئی ہے .... میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ براہ کرم میرے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ صرف بے ایمان صدر لکھ کر پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اور ہم پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ جائیے جائیے ہم بے ایمان ہیں۔ تو آپ سمجھ لیں کہ ہم پیچھا چھوڑ دیں گے۔ آپ بے ایمان ہوں یا ایماندار ہمیں اس سے غرض نہیں ہے۔ ہم کو تو سوالوں کا جواب قومی مفاد کی خاطر زبانی اور ہوائیں) نہیں چاہیئے بلکہ ثبوت کے ساتھ چاہیئے اور تحریر میں چاہیئے۔ خاص طور سے لکھنؤ سوسائٹی سے متعلق .... سوالوں کے جواب پہلے چاہیئے۔ ہم کو اکاؤنٹنٹ سے

نہیں پوچھنا ہے...... آپ خود پوچھ کر ہم کو جواب دے دیں۔ یہ جھلاہٹ بھرا خط ہمارے درد کی دوا نہیں بن سکتا۔ یہ آپ کو اور صرف آپ کو سوچنا ہے.......

.. ..

فقط

والسّلام

محمد شمیم

۱۵ر ستمبر ۹۵ء

حرف آخر

سوسائٹی تو قائم ہے۔ لیکن ساکھ ختم ہوگئی۔ عوام اور خصوصاً کھاتہ داران کو ہم نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے جس جس طرح روپیہ دینے میں رلایا اور پریشان کیا اور ان کے اعتماد کو جس جس طرح ٹھیس پہنچائی ہے۔ سوسائٹی کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ۸۳ء کا بحران ہو یا ۸۸ء کا بحران دونوں کی نوعیت جدا اور دونوں ہماری نظر کے سامنے ہیں اور نہ مقروضین کے زیورات کی ایسی بے قدری سے فروختگی کی کوئی مثال ملتی ہے۔ کھاتہ داران و مقروضین کی بے چارگی و بے بسی کی درد بھری کہانیاں آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ وہ غریب کھاتہ دار جو اپنے ایک ہزار روپیہ کے لئے تین دن سے دوڑ رہا تھا۔ جب وہ آتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ نوٹ تو ہیں نہیں۔ پچیس پچاس پیسے والے صرف سکّے ہیں۔ اس لئے کل لے لینا۔ اتنا کہنا تھا کہ اس نے کہا کہ بھیا ہم کو وہی کا دے دو۔ ہم آج کئی روز سے بہت پریشان ہیں۔ ہم کو ضرورت نہ ہوتی تو ہم نہ آتے۔ لیکن وہاں تو وہ بھی نہیں تھا جو اسے دیا جاتا اور رہی نہیں وہ غریب برقعہ پوش عورت کی پریشانی جس کا بچہ بیمار تھا۔ اسے دوا تک کے پیسے سوسائٹی سے نہیں مل سکے۔ اس طرح کے کئی ایک واقعات خود ہماری آنکھوں نے دیکھے ہیں اور یہ کوئی ایک دو واقعات کی بات نہیں ہے۔ محمد ایوب قریشی جو سوسائٹی کی مجلس عامہ کے رکن ہیں۔ غالباً تین سال پہلے سوسائٹی ٹاؤن مجھے لکھنؤ" ملی لاج" میں دکھا رہے ہیں۔ ان کی والدہ یا بیوی سنجے ہاسپٹل لکھنؤ میں بھرتی ہوئیں۔ ان

کا آئینہ بنا ہونا ہے۔ وہ اپنا درد مجھ سے بیان کرتے ہیں اور روپیہ کے لئے پریشان ہیں۔ کیا یہ حقیقتیں نہیں ہیں؟ ...... جن کھاتہ داروں کے سہارے ہم موج مستی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ہم نے آئے دن انھیں ان کا روپیہ دینے میں پریشان کیا لیکن ان کی مجبوریوں و پریشانیوں کی ہم نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے آگے کبھی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اس طرح کے واقعات ۱۹۹۰ء کے بعد سے وقفہ دے دے کر رونما ہوتے رہے ہے۔ لیکن ہماری خود پسندی و خودسری نے ہمیں سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ ہم پر اس قطع کی بے ہوشی طاری رہی کہ ہم گرتے ہوئے بھی سمجھتے رہے کہ ہم ابھرے ہوئے ہیں۔ اس طرح طاقت کا احساس غرور اور دھوکہ میں تبدیل ہوتا رہا۔ بس یہی وہ چیز تھی جس نے ہمارے دل و دماغ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب اس ادارے کے دن گنے ہوئے ہیں ہم نے اگر خط لکھا تو اسے بزدلی پر محمول کیا گیا۔ حالانکہ ہم نے اپنے خطوں میں بہت ہی واضح الفاظ میں ان کمزوریوں کو اجاگر کرتے ہوئے۔ یہاں تک لکھ دیا تھا کہ — سوسائٹی کا ڈھنچر نیچر نکلنا لازمی ہے۔ اس سے بھاری بھرکم لفظ ہمارے پاس کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اور یہ جملہ ۱۷ مارچ ۱۹۹۱ء سے پہلے کے خطوں میں بھی اور اس کے بعد بھی مقرر دہرایا جاتا رہا۔ لیکن واہ رے ترقی کی مدہوشی کہ اس نے آنکھ کھولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور دسمبر ۱۹۹۴ء میں کھاتہ داران و مقروضین کو سوسائٹی میں روپیہ جمع کرنے یا قرض لینے کی پاداش میں انتہا تک پہنچا دیا گیا۔ اور ان کے اعتماد کو جس طرح تار تار کیا گیا کیا اس کی بھرپائی اب ممکن ہے؟ ...... اور ماسٹر نعیم اللہ کی صدارت میں تو اب ممکن بھی نہیں۔ کیونکہ ان میں غلطی کو غلطی تسلیم کرنے اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر پشیمان اور شرمندہ ہونے کی شاید اخلاقی جرأت بھی اب باقی نہیں رہ گئی۔ ان کے احساس ضمیر کی دیوار پست ہوتے ہوتے زمین بوس ہو چکی ہے۔ وہ اپنی ہر کمزوری کے لئے جواز تراش کر اسے عقلی رنگ دینے کی یا تو کوشش کرتے رہے ہیں یا مخالفین و حاسدین کا گلا شکوہ۔ اور اب بھی وہ یہی روش پر قائم ہیں۔ لیکن اب ان کے اس ڈرامے اور نوٹنکی میں کوئی دم نہیں ہے۔ اپنے ہوں یا پرائے دوست ہوں یا دشمن، مخالف ہوں یا موافقین، حاسد ہوں یا بہی خواہ عوام ہوں یا خواص سب پر حقیقت واضح ہو چکی ہے۔

کیونکہ ہم نے ناموری اور صرف ناموری کے لئے جہاں سوسائٹیوں کے جال بچھانے شروع کئے۔ وہیں سوسائٹی سے اپنا مفاد بھی وابستہ کرنا شروع کردیا۔ اور جب مفاد کی وابستگی اعتدال سے تجاوز کر گئی۔ تو فکر و عمل پر غرور اور گھمنڈ کی چھایا منڈلانے لگی۔ ابا تو پیچھے ہی رہ گئے۔ بیٹوں کے دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گئے۔ بڑھ بڑھ کر باتیں کرنا۔ دوسروں کو چڑھانا کسی کو خاطر میں نہ لانا۔ تذلیل و تحقیر کے وہ انداز گفتگو اور طرزِ عمل کے وہ طریقے، کیا لوگ اتنی جلد بھول جائیں گے؟ .... ماسٹر صاحب کی تو قربانیاں تھیں۔ اس لئے اگر وہ کسی کو کیا۔ اپنے ہم رتبہ والے کو بھی ڈانٹ دیتے تھے تو لوگ اسے سن کر درگذر کر کے بھول جاتے تھے اور آج بھی لوگ ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بھولنے کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو سنبھال و سدھار لیں۔ لیکن یہ لڑکے جنھیں ابھی تک خود اپنی زندگی کی راہ متعین کرنے تک کی تمیز نہیں ہوئی۔ وہ سب کے آقا بن کر لوگوں کو سبق پڑھائیں اس کو کون برداشت کر سکتا ہے! ..... وہی جس نے اپنا ضمیر ماسٹر صاحب کی جیب میں رکھ دیا ہو۔ حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم اپنی کتاب عالم عربی کا المیہ میں لکھتے ہیں کہ "مجھے اصل خطرہ اس ضمیر سے ہے۔ جس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ضمیر کا کام ہے احتساب اور غلطیوں کی گرفت۔ خواہ وہ اپنے بھائی اور باپ سے سرزد ہوئی ہو یا کسی ذی وقار پیشوا اور رہنما سے۔ اگر یہ ضمیر مردہ ہو جائے۔ اپنا فطری عمل چھوڑ دے اپنی افادیت کھو بیٹھے اور اس میں حقائق کے اعتراف کی صلاحیت باقی نہ رہ جائے تو یہی سب سے بڑا خطرہ۔ یہ انسانیت کی موت ہے۔ ایک انسان مرتا ہے تو ہزاروں پیدا ہو جاتے ہیں لیکن جب ضمیر مردہ ہو جائے۔ اجتماعی اور قومی ضمیر سے زندگی کے آثار نابید ہو جائیں جب قوم سے محاسبہ کی صلاحیت اور جرأت ختم ہو جائے۔ جب تنقید و احتساب کی جگہ شاباشی اور داد تحسین کے پھول برسنے لگیں تو یہ ایسا المیہ ہو گا جس کے بعد کسی المیہ کا تصور ہی ممکن نہیں ...... اصل معیار ہے۔ قلب و ضمیر جب قوم میں اتنی ہمت اور جرأت نہ ہو کہ اپنے قائد کی غلط کاری پر ٹوک سکے تو ایسی قوم کو جو سر پھرا بھی چاہے غلام بنا سکتا ہے ہر جاہل و احمق اس کی عزت و شرف کی دھجی بکھیر سکتا ہے۔ ایسی قوم ہر ظلم و زیادتی کا شکار

ہوسکتی ہے .... کسی فرد کی یا کسی جماعت کی اندھی اطاعت گمراہی کے ایسے غار میں پہنچا دے گی جہاں ہدایت کی روشنی نہیں پہنچ سکے گی اور نہ اس سے نجات آسان ہوگی اور قیادت کا محاسبہ نہ کرنا اور ان کی غلطیوں کا مواخذہ نہ کرنا اور ان سے وضاحت نہ طلب کرنا۔ یہ اور بھی بڑی گمراہی ہے۔"

غور کیجئے مولانا کے اس اقتباس پر۔ اور پھر آپ حضرات اپنے قلب وضمیر سے فتویٰ طلب کیجئے۔ کیا اب بھی جبکہ بگاڑ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ ہم اصلاح کی امید پر کیا خاموش اس لئے رہیں کہ وہ ہمارے ماموں، استاد و سرپرست ہیں؟ ...... جب تک چپ چپ (خطوط والا) معاملہ چلتا رہا۔ ہم اچھے، ہماری باتیں اچھی، اور جب سے ہم نے کھل کر بیٹھ پیچھے نہیں سامنے اور دوسروں سے وہی باتیں کہنا شروع کر دی۔ تو پھر ہم بُرے ہماری بات بُری، ہماری سوسائٹی بُری۔ کہا جا رہا ہے کہ شمیم کو لوگوں نے گمراہ کر دیا ہے۔ کل جب ہم خط لکھا کرتے تھے یا کچھ مخالفت یا روک ٹوک کرتے تھے تب کہا جاتا تھا کہ شمیم بزدل ہیں۔[1] چھوٹے دل کے ہیں اور اب گمراہ کہا جا رہا ہے۔ اور بعید نہیں کہ ابھی نہ جانے کیا کچھ کہا جائے۔ لیکن ہمیں کبھی قطعی اس کی پرواہ نہیں رہی کہ کون کیا کہے گا؟ ..... کون کتنا خفا و ناراض ہوگا؟ یا مجھے سوسائٹی سے نکال دیا جائے گا ـــ اگر یہی پرواہ کرتا تو پھر خطوط لکھنے اور کچھ کہنے سننے کی کیا ضرورت تھی؟ حالانکہ ہم نے جو کیا اور کہا اس میں محبت، خلوص و اصلاح کا جذبہ ہی کارفرما تھا اور ایک خط میں ہم نے یہاں تک لکھ دیا تھا کہ ـــ" میں سوسائٹی سے منسلک رہوں یا نہ رہوں اس کی مجھے پرواہ نہیں ہے۔ لیکن میں اپنا فرض نبھانے سے چشم پوشی کروں

---

[1] ماسٹر صاحب تو بزدل کہتے ہی تھے۔ ۶۹۲ء سے صاحبزادے بھی کہنے لگے کیونکہ کانپور سوسائٹی کے ہم مخالف تھے۔

اس کی پرواہ مجھے ضرور ہے" اس طرح بحیثیت بھانجے بحیثیت شاگرد میں نے ہر طرح آگاہ کرکے سخت سست رویہ اپنا کر بھی اپنا فرض ادا کیا۔ اور آج بحیثیت رکن سوسائٹی وہ کررہا ہوں۔ جس میں محبت کے جذبات کم۔ مخالفت اور صرف مخالفت کے جذبات زیادہ ہیں۔ اور یہ اب ہماری مجبوری بن گئی ہے۔

میرے دل کو جتنی تکلیف ہے۔ اسی تکلیف کا نتیجہ ہے کہ ہم نے کتابچہ شائع کرنے کی جرأت کی۔ اور واقعات کی روشنی میں حقائق بیان کرکے ہم نے جہاں ماسٹر صاحب کی تعریف و توصیف کی ہے۔ وہیں ان کی کمزوریوں کو اجاگر کر تلخ باتیں بھی لکھی ہیں اور یہ جان کر لکھی ہے کہ ماسٹر نعیم اللہ شاید اب بھی اپنے ایک نالائق، بے وفا، احسان فراموش بھانجے کے طعنے سن کر ہی پھر اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ ابھی وقت ہاتھ سے جانے نہیں پایا ہے۔ بس ایک مضبوط فیصلے اور نفس کی تھوڑی قربانی سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ا؎ افسوس ہے کہ یہ خط جس میں یہ جملہ لکھا تھا، ماسٹر فیض الحسن صاحب (آزاد کالج) کی لاپرواہی و کوتاہی کی وجہ سے شاید ماسٹر صاحب تک نہیں پہنچ سکا۔